بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیریز
محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید
356
موت کا غار
اشتیاق احمد

ناشر : طاہر ایس ملک
تزئین : محمد سعید نامدار
سرورق : انداز
سرکولیشن مینیجر : محمد یار میجر

طاہر ایس ملک
نے (صفدر علی) لال عبدالرشید پرنٹرز، لاہور
سے چھپوا کر
انداز پبلی کیشنز (مطبوعات اشتیاق، لاہور)
سے شائع کیا۔

اس ناول کے تمام واقعات، مقامات اور کردار فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مشابہت یا مطابقت محض اتفاقی امر ہوگی جس کے لیے مصنف یا پبلشر ذمہ دار نہ ہوں گے۔

قیمت 30 روپے

حدیث شریف

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے کسی قوم میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا گیا ، جس کے مددگار اور دوست اسی قوم میں سے نہ ہوں ۔ ایسے مددگار اور دوست جو اس طریقے پر چلنے والے ہوتے اور اس کے احکام کی پوری اطاعت کرتے ، پھر ان کے بعد ایسے نالائق لوگ پیدا ہوتے ہیں ، جن کو ناخلف کہا جاتا ہے ۔ یہ لوگ ایسی بات کہتے جس کو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا انہیں حکم نہیں ملا تھا ۔ پس جو شخص ان لوگوں سے اپنے ہاتھوں سے جہاد کرے ، وہ مومن ہے ۔ اور جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے ، وُہ مومن ہے ۔ اور جو اپنے دل سے جہاد کرے ، وُہ مومن ہے ۔ اور اس کے بعد یعنی جو شخص اتنا بھی نہ کرے ، اس میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہے ۔

(مسلم ، جلد نمبر ۱ ، صفحہ نمبر ۱۱)

o

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھ سے فرمایا، اے میرے بیٹے، اگر تجھ سے
یہ ممکن ہو تو صبح سے لے کر شام تک اس حال میں بسر کر دے کہ
تیرے دل میں کسی سے کینہ اور کھوٹ نہ ہو تو تُو ایسا ہی کر،
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، اے میرے بیٹے، یہی
میرا طریقہ اور سنت ہے۔ بس جس شخص نے میرے طریقے کو
پسند کیا، اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے مجھے دوست رکھا،
وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔

(مشکوٰۃ، جلد نمبر ۱، صفحہ ۱۱۰)

○

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلّم، فلاں عورت زیادہ نماز پڑھنے، روزے رکھنے اور خیرات کرنے میں
بہت شہرت رکھتی ہے، لیکن وہ اپنی زبان سے اپنے ہمسایوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، وہ دوزخ میں جائے گی۔ اس شخص نے
عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم، اور فلاں عورت جس کی نسبت کہا جاتا
ہے کہ وہ بہت کم روزے رکھتی ہے، بہت کم خیرات کرتی ہے اور بہت
کم نماز پڑھتی ہے اور صرف چند ٹکڑے پنیر کے اللہ کے راستے میں دیتی
ہے، لیکن اپنی زبان سے اپنے ہمسایوں کو تکلیف نہیں دیتی۔ آپ صلی اللہ
علیہ وسلّم نے فرمایا، وہ جنت میں جائے گی۔

(مشکوٰۃ، جلد نمبر ۲، صفحہ نمبر ۱۹۷)

دو باتیں

السلامُ علیکم! اکثر اوقات مجھ سے ایک سوال پُوچھا جاتا
ہے۔ آخر آپ یہ اتنے ناول لکھ کیسے لیتے ہیں؟ اس
سوال کا میرے پاس نہ کوئی جواب ہے، نہ شاید ہو گا۔
لیکن سوال کرنے والے کو کوئی جواب نہ دینا بد اخلاقی
ہے۔ جواب میں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہوتا ہے، لہٰذا ایک
بات تو میں یہ کہہ دیتا ہوں کہ قلم سے۔ اور اگر وہ
میرے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوتے تو پھر دُوسری
بات انھیں مطمئن کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ مجھے خود
معلوم نہیں کہ کیسے لکھ لیتا ہُوں۔

اور سچ بات ہے بھی یہی۔ دراصل میں نہیں
جانتا، میں یہ ناول کیسے لکھ لیتا ہوں۔ اس سے بھی
زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مجھے تو ناول لکھنا آتا ہی
نہیں۔ اس فن سے میرا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔
آپ کہیں گے۔ یہ میں نے ایک ہی چھوڑی ہے۔

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ

- یہ وقت نماز کا تو نہیں ـــــ
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا ـــــ
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں ـــــ
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا ـــــ
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

فقط:

اشتیاق احمد

کچی پکی ترکیب

خان رحمان نے اس نئے سوٹ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور بولے:

"یہ کپڑا مَیں نے کب خریدا تھا؟"

"جی ـــ مَیں نے کب کہا۔" ظہور گڑبڑا کر بولا۔

"مَیں نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ بات تم نے کہی ہے، مَیں تو تم سے یہ پُوچھ رہا ہُوں کہ یہ کپڑا مَیں نے کب خریدا تھا۔" خان رحمان نے کہا۔

"آپ جب کپڑا لینے بازار جاتے ہیں تو مجھے ساتھ نہیں لے جاتے، دوسرے یہ کہ جب بھی آپ کپڑا خریدتے ہیں تو سیدھے اپنے درزی کے پاس چلے جاتے ہیں، لہٰذا مَیں یہ کس طرح بتا سکتا ہُوں کہ فلاں کپڑا آپ نے کب خریدا اور کب نہیں۔"

"ظہور!" خان رحمان نے غصّے کے عالم میں کہا۔

"جی حضور!" ظہور مُسکرایا۔

"جتنی بات پُوچھی ہے، اتنی کا جواب دو، آئیں بائیں شائیں نہ کرو۔"

"میں تو یہ بھی نہیں جانتا حضور۔" ظہور نے فوراً کہا۔

"کیا نہیں جانتے؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"یہ کہ آئیں بائیں شائیں کیا ہوتا ہے۔"

"میں تم سے سوٹ کے کپڑے کی بات کر رہا ہوں اور تم اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہو، اس کا مطلب ہے، دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔"

"آپ دال کی اچھی طرح تلاشی لے لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ظہور نے خوش ہو کر کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"جی۔ فی الحال تو چلا ہوا محسوس نہیں ہو رہا۔"

"مار کھاؤ گے۔"

"میرا پروگرام تو ہرگز نہیں ہے۔"

"تو پھر سیدھی طرح بتاؤ۔ یہ سوٹ کہاں سے آیا؟"

"درزی کے ہاں سے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"درزی کو کپڑا کس نے دیا تھا۔ ویسے مجھے معلوم ہوتا ہے، تم آج کل روزانہ محمود، فاروق اور فرزانہ کے پاس جا کر کچھ وقت گزارنے لگے ہو۔"

"ہائیں! یہ آپ نجومی کب سے بن گئے۔" ظہور دھک سے رہ گیا۔

"کیا مطلب؟" خان رحمان زور سے چونکے۔

"آپ کا یہ اندازہ بالکل درست ہے۔ میں آج کل ایک چکر ان کی طرف ضرور لگاتا ہوں۔"

"اوہو اچھا۔ کمال ہے۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔"

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ آپ کی یونہی کہی ہوئی ایک بات بالکل درست نکلتی ہے۔" ظہور نے خوشی کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ سوال اپنی جگہ پر اب بھی موجود ہے کہ یہ کپڑا مَیں نے کب خریدا؟"

"اور میں آپ کے اس سوال کا جواب بہت دیر ہوئی دے چکا ہوں۔"

"دیکھو بھئی۔ سیدھی طرح بتا دو۔ ورنہ پُوچھ تو مَیں محمود، فارُوق اور فرزانہ سے بھی لوں گا اور وہ جھوٹ ہرگز نہیں بولتے۔" خان رحمان بولے۔

"ارے باپ رے۔ آپ ان سے پُوچھ لیں گے۔ گویا آپ نے یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ اس معاملے میں ان کا بھی کوئی تعلق ہے۔"

"بھئی آخر میں بھی تو انسپکٹر جمشید کی صحبت میں رہتا ہوں۔"
خان رحمان نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں! آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ دراصل یہ ترکیب مجھے انھوں نے ہی بتائی تھی۔"

"کون سی ترکیب۔ صاف صاف بات کیوں نہیں بتاتے۔"

"آپ نے پچھلے ماہ جو بالکل نیا سوٹ مجھے لا کر دیا تھا، اس پر اگرچہ استری بہت اچھی کی گئی تھی، پھر بھی میں نے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے لیے اس پر استری پھیرنا شروع کر دی۔ ادھر سلمیٰ بیگم نے منّے کے رونے کی آواز سُنی تو وہ ہانڈی چولھے پر چھوڑ کر منّے کی طرف دوڑ گئی۔ میں نے جو ہانڈی جلنے کی آواز۔ میرا مطلب ہے۔ خوشبو سُنی۔ سُنی نہیں سونگھی تو باورچی خانے کی طرف دوڑ گیا۔ اور حسبِ معمول یہ بھول گیا کہ استری کو کوٹ کی آستین پر چھوڑ آیا ہوں۔ اب مشکل یہ ہے جناب کہ جلی ہوئی آستین والا کوٹ آپ پہنتے نہیں، لہٰذا میں فوراً جان گیا کہ اب دو گھنٹے تک کان پکڑنے پڑیں گے، اس کی ترکیب میرے ذہن میں یہ آئی کہ فوراً محمود، فاروق اور فرزانہ کے پاس دوڑا گیا اور ان سے فریاد کی کہ مجھے دو گھنٹے تک کان پکڑنے سے بچا لیں۔ انھوں نے پہلے تو ناک بھوں چڑھائیں۔

پھر فرزانہ نے کہا۔ تمھیں بچاتے۔ بچاتے تو ہمارے پاس ترکیبوں کا سٹاک ختم ہو گیا۔ اب تو بس ایک آخری ترکیب رہ گئی ہے۔ دماغ کے ایک بہت دُور کے خانے میں، میں خوش ہو گیا اور اس سے کہا کہ مہربانی فرما کر اس بچی کھچی ترکیب کو ہی باہر نکال لیں۔ فرزانہ نے مجھ پر احسان کیا اور اپنے دماغ کی آخری ترکیب بھی نکال باہر کی۔ اور وہ ترکیب یہ تھی کہ میں ایسا ہی کپڑا بازار سے خرید کر آپ کے درزی کو دے آؤں۔ اس طرح دو گھنٹے تک کان پکڑنے سے بچ جاؤں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایسی ترکیب تھی کہ جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا، ہائیں، شاید اس موقعے پر کوئی اور محاورہ بولا جانا چاہیے تھا۔ ہاں یاد آیا۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ ایسی ترکیب تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تو میں بازار گیا۔ بلکہ اس دکان پر گیا جس سے آپ ہمیشہ کپڑا خریدتے ہیں۔ اور سوٹ اسے دکھا کر کہا کر ایک سوٹ کا کپڑا اس کے ساتھ کا اور دے دیں اور پیسے آپ کے حساب میں لکھ لیں۔"

"کیا کہا۔ پیسے بھی تم نے میرے حساب میں لکھوا دیے۔" خان رحمان چلائے۔

"جج - جی ہاں - مرتا کیا نہ کرتا - میرا اتنا بنک بیلنس کہاں - آدھی سے زیادہ تنخواہ تو آپ سوٹ پر سوٹ جلانے کے جرم میں کاٹ لیتے ہیں۔"

"تو اور کیا کروں - تم بھی تو سوٹ پر سوٹ جلانے پر اُتر آتے ہو - بھئی قمیص شلوار جلا لیا کرو۔" خان رحمان فوراً بولے۔

"شکریہ! اب آپ کے اس نئے مشورے پر عمل کروں گا اور دیکھوں گا کہ اس طرح کس حد تک کم سزا ملتی ہے۔ ہاں تو میں کیا کہ رہا تھا؟"

"پتا نہیں - ہاں دماغ ضرور چاٹ رہے تھے۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"یاد آگیا - کپڑے والے سے میں نے کہا کہ حساب کتاب آپ کے ذمے ہو گا - بس آپ تو مجھے کپڑا دے دیں - اب مشکل یہ ہوئی کہ اس کے ساتھ کا کپڑا ان کے پاس بالکل ختم ہو گیا تھا - میں نے انھیں بتایا کہ اور کوئی کپڑا تو مجھے پکڑوا دے گا، لیکن وہ بے چارے بھی کیا کر سکتے تھے - میں بھی مرتا کیا نہ کرتا - اس کے ساتھ کا ذرا سے فرق والا کپڑا لانے پر مجبور ہو گیا اور آپ کے درزی کو دے آیا - سلائی بھی آپ کے کھاتے میں

ڈلوائی - اور"

"کیا - سلائی بھی تم نے ادا نہیں کی - سوٹ کا کپڑا بھی بدلوا ڈالا - اور اب یہ امید بھی رکھتے ہو کہ میں تمھیں کان نہ پکڑواؤں - ایسا نہیں ہو گا - تمھیں سزا ضرور ملے گی - لیکن اس وقت نہیں، اس وقت تو میں بہت ضروری دعوت میں جا رہا ہوں - وہاں انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ اور پروفیسر داؤد بھی ہوں گے - وہیں میں تمھاری ان سے شکایت لگاؤں گا - جانتے ہو، شکایت کیوں لگاؤں گا؟"

"شکریہ جناب! میں نہیں جانتا۔"

"تو شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہو۔"

"آپ بتانے والے ہیں نا، اس لیے پہلے ہی شکریہ ادا کر دیا۔"

"سنو بھائی - وہ اکثر تمھاری سفارشیں کرتے رہتے ہیں - اس لیے میں بھی تمھاری شکایت ان سے ہی لگا سکتا ہوں۔"

"ضرور لگائیے جناب ضرور لگائیے۔" ظہور نے خوش کر کہا۔

"اس لیے کہہ رہے ہو نا کہ وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے، خیر خیر - میں واپسی پر تم سے نبٹ لوں گا۔"

خان رحمان پیر پٹختے ہوئے گھر سے نکل آئے - اپنی

کار میں بیٹھے اور نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کار کے
اندر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ ابھی نصف کلومیٹر دُور
آئے ہوں گے کہ ان کی گردن سے کوئی ٹھنڈی ٹھار چیز
آ لگی۔

"یہ - یہ - یہ کیا ہے؟" ان کے منہ سے نکلا۔

"پستول کی نال کا ٹھنڈا لوہا - سردیوں کے موسم میں ذرا
بُرا لگتا ہے - جس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں" پیچھے سے
آواز آئی۔

"کون ہو تم" انھوں نے کار کو بریک لگائے۔

"اِدھر گاڑی رکی - اُدھر میں نے فائر کیا - لہٰذا چلتے
رہیے" سرد آواز میں کہا۔

خان رحمان نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"شمالی سڑک پر چلو - وہیں چل کر بتاؤں گا"

"اور اگر میں نہ چلوں"

"تو پھر اس پستول سے نکلنے والی گولی اتنی ٹھنڈی نہیں
ہو گی"

"اپنی شامت کو آواز دے رہے ہو دوست - تم
مجھے نہیں جانتے"

"آپ خان رحمان ہیں"

"اوہو اچھا - کمال ہے"

انھوں نے کار شمالی سڑک کی طرف موڑ لی اور پھر
ویران جگہ پہنچ کر اس نامعلوم آدمی نے کہا:

"بس گاڑی سڑک سے اتار کر درختوں کے جھنڈ میں
لے چلو"

"ارادے کیا ہیں؟"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے - فکر کی بات کیا ہے" اس
نے ہنس کر کہا۔

اور پھر وہ ایک جھنڈ میں پہنچ کر رک گئے۔

"جگہ بہت خوب صورت ہے - اب آپ یہ سوٹ لے
لیجیے - اپنا سوٹ اُتار دیں اور یہ سوٹ پہن لیں" اس
نے کہا۔

"کیا مطلب - یہ تم کیا کہہ رہے ہو - آخر میں ایسا کیوں
کروں - اور تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟"

"تم ایسا اس لیے کرو کہ میں یہی چاہتا ہوں اور میں کیا
چاہتا ہوں - یہ جاننے کے چکر میں نہ پڑیں"

انھوں نے دیکھا - پستول کی نال ٹھیک ان کے سر
کا نشانہ لیے ہوئے تھی - آخر وہ کار سے نیچے اُتر آئے:

"میں درخت کی اوٹ میں جا کر کپڑے تبدیل کروں گا
خان رحمان بولے۔

"ہرگز نہیں۔ آپ کو میرے سامنے ایسا کرنا ہو گا۔
جلدی کریں۔"

آخر انھوں نے سوٹ تبدیل کر لیا۔ بلا وجہ خطرہ مول
لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

"شکریہ! آپ اچھے آدمی ہیں۔" پستول والے نے کہا۔

"وہ تو خیر ہو گا۔ لیکن میں بہت حیران ہوں۔
آپ کی اس حرکت کا مقصد میری سمجھ میں بالکل نہیں
آیا، آخر آپ نے میرا سوٹ کیوں اتروایا۔ آپ اس کا کیا
کریں گے۔"

"یہ آپ کا مسئلہ نہیں۔ آپ اپنے آپ کو پریشان نہ
کریں۔ اور ہاں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

"کیا کہا۔ میں جا سکتا ہوں۔" وہ بولے۔

"ہاں بالکل۔"

"اور آپ یہاں سے واپس کس طرح جائیں گے۔" خان
رحمان نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"میں چلا جاؤں گا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔"

"تو آپ میرے ساتھ ہی شہر تک کیوں نہیں چلتے۔ آپ

کو ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں آپ کے خلاف
کوئی قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔ آپ نے بدلے میں
مجھے سوٹ بھی تو دیا ہے۔ کارروائی تو میں اس وقت
کرتا جب آپ مجھے ننگا یہاں چھوڑ جاتے۔"

"اب میں اتنا بھی بدتمیز نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"اگر آپ یہ بھی بتا دیتے کہ اب اس سوٹ کا کیا
کریں گے۔ تو میری پریشانی دم توڑ دیتی اور میں بے فکر ہو
جاتا۔" خان رحمان بولے۔

"مجھے افسوس ہے۔ یہ بات میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔"

"میں چاہتا تو معلوم کر سکتا تھا، لیکن بغیر کسی وجہ کے
میں خطرہ مول لینے کا عادی نہیں، اس لیے اللہ حافظ۔" خان
رحمان نے کہا اور گاڑی بیک کرنے لگے۔

"اللہ حافظ۔" پستول والے نے ہاتھ ہلایا۔

وہ کار چلاتے ہوئے سڑک پر آئے اور پھر انھوں
نے رفتار بڑھا دی۔ انھیں اگر دعوت کی جلدی نہ ہوتی تو
وہ تعاقب بھی کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی الجھن دور کرنے
کا سامان کر سکتے تھے، لیکن جس شخص کے ہاں انھیں دعوت
میں جانا تھا۔ وہ بہت سخت مزاج آدمی تھا اور خان
رحمان سے اس کے بچپن سے تعلقات تھے۔ لہٰذا اس سے

وعدہ خلافی نہیں کر سکتے تھے ۔ جونہی وہ خان ڈابر کی کوٹھی
کے دروازے پر پہنچے ، انھیں ایک چیختی آواز سنائی دی ۔

" ہائیں ! یہ تم ہو خان رحمان ۔ میں سوچ بھی نہیں
تھا کہ تم تین منٹ لیٹ آؤ گے ۔ تم ایک فوجی آدمی
کیا ہوا ، اگر ریٹائر ہو چکے ہو ، لیکن زندگی تو فوج میں
گزاری ہے ۔ اُف مالک ۔ پورے تین منٹ لیٹ ،
تو دروازہ بند کروا رہا تھا ۔ اور تم جانتے ہو ۔ اگر م
دروازہ ایک بار بند ہو جاتا ہے تو پھر اس پروگرام
حد تک کسی کے لیے نہیں کھلتا ۔"

" تب پھر آج تین منٹ لیٹ کیوں بند کیا ہے ؟" خا
رحمان مسکرائے ۔

" یہ میرے سوال کا جواب نہیں ۔"

" تو پھر تمھارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میرے س
کی کسی کو ضرورت پڑ گئی تھی ۔"

" سوٹ کی ضرورت ۔ یہ کیا بات ہوئی ۔"

" کیوں نہ اندر چل کر اطمینان سے بیٹھ کر بات کی جا

" ہرگز نہیں ۔ پہلے تم مجھے مطمئن کرو گے ، پھر
اندر چلیں گے ۔"

" کیا باقی سب لوگ آ چکے ہیں ؟"

" ہاں بالکل ۔ میری دعوت میں اور کوئی لیٹ پہنچے ۔ بس ایک
تم لیٹ آئے ہو ۔ حالانکہ تم جانتے ہو ۔ میں وقت کا قتلِ عام
ہرگز ہرگز برداشت نہیں کرتا ۔"

" تو ادھر ہی کون برداشت کرتا ہے ، لیکن میں کیا کرتا ۔
میری کار میں ایک پستول بردار شخص سوار ہو گیا تھا ۔ اس نے
پستول کی سرد نال میری گدی پر رکھ کر شمالی سڑک پر چلنے
کے لیے کہا تھا ۔ تم جانتے ہی ہو گے ۔ شمالی سڑک وہ
سڑک ہے ، جو پہاڑوں پر جا کر ختم ہو جاتی ہے اور اس
طرف کوئی دن میں بھی جانا پسند نہیں کرتا ، لیکن میری گدی
پر چونکہ پستول کی نال رکھی گئی تھی ، اس لیے میں نے جانا
پسند کر لیا ۔ وہاں جا کر اس شریف آدمی نے جانتے ہو مجھے
کیا حکم دیا ۔" خان رحمان رک گئے ۔

" کیا حکم دیا ؟"

" ہم بھی خان رحمان کی آواز سن کر چلے آئے ہیں ۔"

" یہ کیسا حکم ہوا ۔" خان ڈابر نے حیران ہو کر کہا ۔

" اس کا حکم میں نے ابھی کب سنایا ہے ۔ یہ آواز تو تمھارے
پیچھے سے آئی ہے ۔"

" ہائیں ! لیکن تم میرے پیچھے سے اپنی آواز میں کس
طرح بول سکتے ہو ۔ بھئی کہیں جادو وادو تو نہیں سیکھنے لگے ۔"

"اوہو۔ تم مڑ کر بھی تو دیکھ لو۔"

خان ڈابر نے مڑ کر دیکھا تو وہاں انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ اور پروفیسر داؤد کھڑے مسکرا رہے تھے:

"اوہ! تو یہ آپ بولے تھے۔"

"معاف کیجیے گا — ہم یہاں اس لیے آ گئے تھے کہ آپ کا جھگڑا ختم کرا دیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جھگڑا بہت سنگین نوعیت کا ہے۔ اور آپ لوگ درمیان میں دخل اندازی نہ کریں۔" خان ڈابر نے جھلا کر کہا۔

"ہم دخل اندازی نہیں کر رہے، لیکن سُن تو سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! سُن ضرور لیں، مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ خان رحمان تین منٹ لیٹ آئے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں — میرے ہاں یہ کتنا سنگین جرم ہے۔ میں اس جرم کی وضاحت چاہتا ہوں۔ اب وضاحت خان رحمان کی زبانی سُنیے۔"

"بالکل ٹھیک۔ خان رحمان شروع سے وضاحت کرو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھی بات ہے۔"

انھوں نے ایک بار پھر شروع سے کہانی شروع کی۔ اور

آخر تک بیان کر دی۔

"یہ۔ یہ تو ایک حیرت انگیز ترین واقعہ ہے۔" محمود فوراً بولا۔

"بلکہ انوکھا ترین۔"

"پہلے اس بات کا تو فیصلہ کر لیں کہ میں اندر داخل ہو سکتا ہوں یا نہیں۔" خان رحمان نے گھبرا کر کہا۔

"کیا خیال ہے۔ آپ لوگوں کا؟" خان ڈابر ان کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔

"اگر ان کا بیان درست ہے تو پھر انھیں اندر آنے کا حق ہے اور جھوٹ یہ بولتے نہیں، اس کی گارنٹی میں دے دیتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن کسی کو ان کا سوٹ اتروانے کی کیا ضرورت تھی؟" خان ڈابر بولے۔

"اس بات پر میں بھی کم حیران نہیں ہوں۔" خان رحمان نے جھلا کر کہا۔

"اچھا اچھا بھائی۔ پہلے اندر آ جاؤ۔ پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" خان ڈابر ہنس پڑے اور خان رحمان منہ بناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد خان ڈابر نے کہا:

"پارٹی ایک گھنٹا دیر سے شروع ہوگی ۔ اس لیے ہم مزے سے اس مسئلے پر بات چیت کر سکتے ہیں۔"

"اچھا! میرے تین منٹ لیٹ آنے پر اعتراض ۔ اور یہاں پورا ایک گھنٹا ضائع کیا جائے گا ۔ یہ کیا بات ہوئی۔" خان رحمان نے بھنا کر کہا۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں ۔ تم جانتے ہو ۔ پارٹی میرے دوست ارمان شیرازی مرحوم کے بیٹے کے وطن آنے کے سلسلے میں دی جا رہی ہے ۔ ارمان شیرازی میرے بچپن کے دوست ہی نہیں، کاروباری شریک بھی تھے ۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو بچپن میں ہی ملک سے باہر تعلیم کے لیے بھیج دیا ۔ وہ خود ہی اس سے ملنے کے لیے جایا کرتے تھے ۔ بیٹے کو سفر کر کے آنے کی کبھی زحمت نہیں دی تھی ۔ یہاں تک کہ جب وہ مرنے لگے تو انھوں نے مجھ سے قسم لی کہ ان کے بیٹے کو ان کے انتقال کی خبر نہ دی جائے ۔ وہ انجینیرنگ کی تعلیم سے فارغ ہو کر جب یہاں آئے گا تو اس وقت اسے یہ خبر دی جائے ۔ اس لحاظ سے آج کا دن غم کا بھی ہے اور خوشی کا بھی ۔ لیکن جہاز ایک گھنٹا لیٹ ہے ۔ میرا مینیجر اپنے ایک ماتحت کے ساتھ ایرپورٹ جا چکا ہے ۔ یہ اطلاع اسی کی طرف سے ملی ہے۔"

"ہوں ۔ وہ کون سی فلائٹ سے آ رہے ہیں؟"

"پی کے ۳۱۱ سے اور دوسری خوش خبری ۔ میں اپنی بیٹی کی شادی عرفان سے کر رہا ہوں ۔ جلد ہی آپ لوگوں کو شادی کے کارڈ مل جائیں گے۔"

"بہت خوب ۔ اب ہم خان رحمان کے کوٹ پر بات کریں گے۔" پروفیسر داؤد نے بلند آواز میں کہا۔

"سب سے پہلے تو خان رحمان ۔ تم اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور پھر محمود کی طرف دیکھا ۔ محمود نے فوراً نوٹ بک نکال لی ۔

"وہ ایک چھوٹے سے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا ۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں ۔ ناک کی نوک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی ، رنگ سرخ و سفید اور بال سفید تھے ۔ چہرہ گول کر لیں۔"

"محمود ۔ تم نے حلیہ نوٹ کر لیا ۔ اپنے انکل کو فون کر کے یہ حلیہ نوٹ کروا دو۔"

"او کے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر فون کی طرف چلا گیا۔

"کوٹ کی ایک کہانی اور بھی ہے ۔ میرا خیال ہے ۔ مجھے وہ کہانی بھی سنا دینی چاہیے۔" خان رحمان بولے۔

"ہائیں! ایک کہانی اور بھی ہے ۔ کمال ہے۔" انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے ۔

"میں خود حیران ہوں - یہ ہو کیا رہا ہے - بیٹھے بٹھائے سوٹ کا چکر کیوں چل گیا۔"

"جلدی بتاؤ خان رحمان - کہیں یہ کوئی سنگین معاملہ نہ ہو - مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہو رہی ہے کہ اس شخص کا لایا ہوا سوٹ تمہارے جسم پر اتنا فٹ کیسے آگیا۔"

"ہاں ! اس پر حیرت مجھے بھی ہے ، لیکن پہلے دوسری کہانی سن لو۔"

اسی وقت محمود واپس آگیا اور آتے ہی بولا :

"انکل اکرام نے اس حلیے پر کام شروع کر دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے - اب اپنے انکل کے سوٹ کی دوسری کہانی سنو۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی - کیا مطلب - سوٹ کی دوسری کہانی۔"

"ہاں ! آج یہ سوٹ کی نہ جانے کتنی کہانیاں سنائیں گے۔" فاروق بولا -

"بہت دیر بعد بولنے کا خیال آیا۔" فرزانہ اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی -

"لیجیے ! اب میرے خاموش رہنے پر بھی اعتراض ہوگیا۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"بھئی پہلے دوسری کہانی۔" انسپکٹر جمشید بولے -

"دوسری کہانی یہ ہے کہ جو سوٹ میں گھر سے پہن کر نکلا تھا ، وہ دراصل میرا اصلی سوٹ نہیں تھا۔"

"کیا مطلب - یہ تم کیا کہہ رہے ہو خان رحمان - کیا وہ سوٹ تم نے کسی دوست سے ادھار لیا تھا؟" خان ڈابر بولے۔

"بھئی پہلے پوری بات سن لو۔" خان رحمان نے تلملا کر کہا -

"اچھا اچھا - تو سناؤ پوری بات۔"

"پوری بات یہ ہے کہ میں نے ابھی چند دن پہلے ایک نیا سلوٹ سلوایا تھا ، وہ سوٹ خاص طور پر اس دعوت کے لیے ہی خریدا تھا ، لیکن ظہور صاحب نے سوٹ جلا دیا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ظہور نے عقل مندی یہ کی کہ مجھے تو بتایا نہیں کہ سوٹ جل گیا ہے - کپڑے کی دکان پر چلا گیا ، وہاں اس کے ساتھ کا کپڑا ختم تھا ، لہذا دوسرے رنگ کا کپڑا میرے حساب میں خریدا اور درزی کو دے آیا ، جب سل گیا تو گھر لے آیا آج جب میں نے اس سے سوٹ مانگا تو وہ اور ہی سوٹ لے آیا - اس وقت مجھے پتا چلا ہے - میں کیا کر سکتا تھا - وہی سوٹ پہن کر باہر نکلا - اور کار میں پستول والے سے ملاقات ہوئی۔"

"تمام باتیں پُراسرار ہیں۔ یہ تو کوئی گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔ خان رحمان تم فون کر کے ظہور کو یہیں بلا لو۔" انسپکٹر جمشید بے تاب ہو کر بولے۔

"یہاں بلا لوں؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! میں اس معاملے میں جُرم کی بُو محسوس کر رہا ہوں۔"

"لیکن ظہور کوئی مجرمانہ کام نہیں کر سکتا۔"

"یہ بات میں نے اس کے سلسلے میں نہیں کہی۔ اس پستول والے کی بات کر رہا ہوں۔ آخر وہ تمھارے جسم سے سوٹ کیوں اتروا کر لے گیا۔"

"لیکن اس سلسلے میں بھلا ظہور کیا بتا سکتا ہے؟"

"بھئی تم بلا تو لو اسے۔" انھوں نے جھلا کر کہا۔

خان رحمان اٹھے اور فون کرنے چلے گئے۔ جلد ہی وہ واپس آ کر بولے:

"ظہور آدھ گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گا۔"

"تم کپڑا کس دکان سے خریدتے ہو۔ اور سلواتے کس سے ہو۔ نام پتے لکھوا دو۔"

"کپڑا رضائی کلاتھ ہاؤس سے خریدتا ہوں اور سلواتا ہیون ٹیلرز سے ہوں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ خان ڈابر میرا خیال ہے۔ ہم تو اس دعوت میں شرکت نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"سوٹ والے کیس پر کام کرنا ہے نا۔"

"تو وہ بعد میں ہو جائے گا۔ یہاں کون سا زیادہ وقت لگے گا۔ عرفان کے آتے ہی ہم کھانا شروع کر دیں گے۔" خان ڈابر نے کہا۔

"خیر۔ دیکھتے ہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ ہم اس دعوت میں شرکت نہیں کر سکیں گے۔ حالات کا دھارا ہمیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔"

"اگر حالات نے اس حد تک مجبور کیا تو پھر میں نہیں روکوں گا۔"

"شکریہ خان ڈابر۔"

عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی، پھر ایک ملازم نے آ کر بتایا:

"انسپکٹر صاحب۔ آپ کا فون ہے۔ کوئی اکرام صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔" وہ اٹھ گئے۔

"السلام علیکم۔ ہاں بھئی۔ کیا رپورٹ ہے؟"

"ریکارڈ میں اس حُلیے کا کوئی آدمی نہیں مل سکا۔ نہ میری یادداشت کے کسی خانے میں ہے۔ اس وقت میں نے فون ایک لاش کے سلسلے میں کیا ہے۔ شہر کی ایک سڑک پر سے کچلی ہوئی ایک لاش ملی ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

حیرت کا سمندر

"لو بھئی۔ شہر کی ایک سڑک سے کچلی ہوئی لاش ملی ہے، اب کیا کریں۔ اِس کیس کی طرف توجہ دیں یا اُس کیس کی طرف؟"

"کچلی ہوئی لاش والا معاملہ تو کوئی خاص نہیں، کوئی شخص کسی گاڑی کے نیچے آ گیا ہو گا، علاقے کا سب اِنسپکٹر خود ہی دیکھ لے گا، ہمیں یہ معاملہ زیادہ پُر اسرار لگ رہا ہے۔" محمود بولا۔

"میرا بھی پہلے یہی خیال ہوا تھا، پھر سوال یہ ذہن میں ابھرا کہ اکرام نے ہمیں کیوں اطلاع دی۔ کسی عام معاملے کے لیے تو ہمیں فون کیا ہی نہیں جاتا۔ مطلب یہ کہ علاقے کا انچارج تو وہاں پہلے ہی پہنچ گیا ہو گا اور پھر اس نے کسی خاص وجہ سے اکرام کو فون کیا ہو گا۔ لہٰذا وہاں بھی جانا ہی ہو گا۔ خیر۔ ایسا کر لیتے ہیں کہ وہاں میں اور خان رحمان۔ نہیں، خان رحمان کا سوٹ والے

سلسلے میں یہاں ٹھہرنا زیادہ ضروری ہے ، وہاں تو صرف میں ہو آتا ہوں۔"

"شکریہ ابا جان ! ہم بھی یہی کہنے والے تھے - ہمارا یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے - تم لوگ یہیں ٹھہرو - میں ادھر سے اگر جلد فارغ ہو گیا تو سیدھا ادھر آؤں گا ، ورنہ پھر گھر ملاقات ہو گی۔" انھوں نے کہا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے -

"اِن شاء اللہ!" ان کے منہ سے نکلا -

ابھی وہ گئے ہی تھے کہ ظہور آتا نظر آیا - اس کے چہرے پر لرزہ طاری تھا :

"السلامُ علیکم - آپ - آپ نے مجھے یہاں بلایا ؟"

"کیوں - کیا ہم تمھیں یہاں نہیں بلا سکتے ۔" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا -

"ضرور بلا سکتے ہیں - فرمائیے - کیا کوئی سوٹ استری کرنا ہے ؟"

"بھر پایا میں تو سوٹ استری کروا کے - اب ان کی باتوں کے جواب دو ۔"

"جی - ان کی کن کی - یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے ۔"

"ظہور انکل - آپ کی نظر کمزور تو نہیں ہو گئی ۔"

"یہ بات نہیں - آپ مجھے نظر آ رہے ہیں - میں سمجھا - خان صاحب کا اشارہ دوسری طرف ہے - اور اس طرف کوئی بھی موجود نہیں۔"

"اچھا خیر - آپ تشریف رکھیے ۔"

وہ یک دم فرش پر بیٹھ گیا :

"ارے بھئی ! یہ کیا - یہاں بیٹھیے نا - کرسی پر ۔"

"اچھی بات ہے ۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا -

"یہ سوٹ کا کیا چکر ہے ؟" محمود نے اسے گھورا -

"اس چکر کے بارے میں تو میں بتا چکا ہوں ۔"

"ایک بار پھر ہم سننا چاہتے ہیں - کوئی بات بتانا بھول رہے ہیں آپ ۔"

"میں - نہیں تو ۔"

"اچھا ، پوری تفصیل سے واقعات سنائیے ۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا -

"م - مجھے کان تو نہیں پکڑنا پڑیں گے ۔" اس نے گھبرا کر کہا -

"خبردار بھئی - کوئی وعدہ نہ کرلینا ۔" خان رحمان جلدی سے

بولے۔

"ہم کوشش کریں گے کہ آپ بال بال بچ جائیں۔" فاروق
مسکرا دیا۔

"تو پھر سُنیئے۔ خان صاحب نے ایک نیا سوٹ سلوایا،
سلوا کر لائے تو میرے حوالے کر دیا۔ اس کی استری قدرے
خراب ہو گئی تھی، لہٰذا میں نے سوچا، استری درست کر
دوں، پتا نہیں صاحب کب مانگ لیں، لہٰذا میں استری
کرنے لگا، ادھر بیگم ہانڈی تیار کر رہی تھیں۔ ایسے میں
منا رو پڑا۔ وہ منّے کو چُپ کرانے کے لیے دوڑ گئیں ا
بے وقوفی یہ کی کہ ہانڈی کو چولھے پر چھوڑ گئیں۔ میں نے
جو ہانڈی جلنے کی بُو محسوس کی تو فوراً باورچی خانے کی طرف دو
گیا۔ یہاں مجھ سے بے وقوفی ہوئی۔ کہ استری سوٹ پر چھو
گیا، واپس لوٹا تو سوٹ جل چکا تھا۔ اب مجھے فکر ہوئی
بالکل نیا سوٹ اور قیمتی بھی۔ اس کا مطلب تھا کم از کم دو گھنٹے
کے لیے کان پکڑنا پڑتے۔ ایسے میں میرے ذہن میں ایک
ترکیب آئی۔ مجھے اس دکان کا پتا ہے۔ جس سے خان صا
کپڑا خریدتے تھے۔ لہٰذا میں سیدھا وہاں گیا۔ سوٹ دکھ
کر ان سے کہا کہ ایک سوٹ کا کپڑا اور دے دیں، دُ
مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ بہت مرتبہ خان صاحب نے

وہاں کپڑے وغیرہ کے سلسلے میں بھیجا ہے۔ لہٰذا انھوں نے
دکان میں دیکھا، اس کے ساتھ کا کپڑا بالکل ختم تھا۔ اب
تو بہت چکرایا، پھر اس سے مِلتا جُلتا کپڑا خریدا، حساب
کتاب خان صاحب کے نام لکھوایا اور ان کے درزی کے
پاس پہنچا۔ اسے سوٹ کا کپڑا دے کر ہدایت کی کہ اسے جلد
سی دے؛ چنانچہ اس نے تین دن بعد ہی سوٹ دے دیا
اور مَیں نے وہ سوٹ لا کر رکھ دیا۔ آج جب انھوں نے
سوٹ مانگا تو میں نے دے دیا۔ آخر اس میں میرا کیا قصور؟"
یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"لو اور سنو۔ ان کا کوئی قصور ہی نہیں۔" خان رحمان نے
جھلا کر کہا۔

"آئیے۔ آپ کے کپڑے والے کے پاس چلتے ہیں۔"

"لک۔ کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے جناب؟" ظہور نے کانپ
کر کہا۔

"لو اور سنو۔ ابھی انھیں گڑبڑ ہی نظر نہیں آئی۔ میرے
جسم پر تمھیں کیا نظر آ رہا ہے؟"

"اوہ ارے ہائیں۔ یہ۔ بلکہ وہ۔ وہ سوٹ کہاں گیا اور یہ
کہاں سے آیا؟"

"بتاؤ بھئی۔ انھیں۔"

"ظہور انکل - آپ گھر جائیں - کل اخبار میں پڑھ لیجیے
کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔"

"یا اللہ رحم۔" اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی باہر نکلے اور کپڑے کی مارکیٹ پہنچے - دکان
کے مالک نے لپک کر خان رحمان کا استقبال کیا، شاید
ان کے بہت پرانے اور بڑے گاہک تھے :

"آئیے جناب خان صاحب۔"

"میری طرف آپ کا کچھ حساب کتاب ہے - ذرا بتائیے
تو کتنا ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

"ایسی کیا بات ہے جناب - آجائیں گے پیسے۔"

"نہیں، آپ دیکھیے تو سہی۔"

اس نے کھاتہ منگوایا اور اس میں دیکھ کر بولا :

"صرف دو ہزار تین سو روپے - ظہور صاحب جو سوٹ
لے گئے ہیں صرف اس کے - اس سے پہلے تو آپ نے
کبھی ادھار کیا ہی نہیں۔"

"شکریہ - یہ لیجیے دو ہزار تین سو روپے - ظہور کو آپ
نے جو کپڑا دیا تھا - وہ ذرا ہمیں بھی دکھائیے۔"

"کیوں - کیا وہ آپ تک نہیں پہنچا۔" دکان دار نے حیران
ہو کر کہا۔

"بس پہنچ بھی گیا اور نہیں بھی آپ وہ کپڑا دکھا دیں۔"

دکان دار نے فوراً ان کے سامنے کپڑے کا تھان منگوا
کر رکھ دیا۔

"یہ سارا تھان ہی ہمیں دے دیں۔" محمود بولا۔

"جی بہت بہتر - بہت پسند آگیا ہے آپ کو۔"

"جی ہاں! یہ کون سی مل کا ہے؟"

"مون لائٹ ٹیکسٹائل ملز کا - ہمارے ملک کی سب
سے بڑی کپڑے کی مل ہے۔"

"ہوں - شکریہ!"

تھان خرید کر وہ وہاں سے نکل آئے :

"اب ہم آپ کے درزی سے بھی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے - یہاں سے کچھ ملا یا نہیں؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں - اس تھان کو لیبارٹری میں بھیجا
جائے گا۔"

وہ درزی کی دکان پر پہنچے، یہ شہر کی ایک مشہور دکان
تھی - دکان کے مالک نے خان رحمان کا گرم جوشی سے استقبال
کیا۔

"آپ کو زحمت دینے آئے ہیں - یہ آپ سے چند سوال
کریں گے۔" خان رحمان نے محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرف

اشارہ کیا۔

"ضرور جناب! کیوں نہیں۔"

"اس سوٹ سے ملتا جلتا کوئی اور سوٹ بھی سلنے کے لیے آیا ہوا تھا؟"

"ہاں شاید! ایسی بات ہے تو سہی۔" اس نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"اچھی طرح یاد کرکے بتائیں۔ جب خان صاحب کا ملازم ظہور آپ کو سوٹ دے کر گیا اور تین دن بعد سوٹ لے گیا تو اس کے بعد کوئی شخص اپنا سوٹ لینے آیا تھا اور ا نے یہ کہا تھا کہ اس کا سوٹ بدل گیا ہے۔"

"ہاں! یہ بات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے معا مانگی تھی اور یہ کہا تھا کہ میں ابھی ان کے والا سوٹ منگوا دیتا ہوں۔ لیکن اس نے کہا کہ نہیں۔ وہ خود ہی تبدیل کرلے گا۔ لہٰذا وہ وہ سوٹ ہم سے لے گیا جو ک ظہور صاحب کو لے جانا چاہیے تھا۔"

وہ دھک سے رہ گئے۔ اور دکان سے باہر نکل آئے:

"اگر بات صرف اتنی سی تھی۔ یعنی سوٹ بدل گئے تھے تو وُہ پستول کے بغیر بھی سوٹ واپس لے سکتا تھا۔ اس نے یہ خوفناک طریقہ کیوں اختیار کیا؟"

میرا خیال ہے۔ ظہور کچھ چھپا رہا ہے۔ وُہ آدمی ظہور سے جا کر ضرور ملا ہو گا۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

وہ فوراً خان رحمان کے گھر پہنچے۔ ظہور کو بلایا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے:

"کوئی شخص آپ کے پاس آیا تھا اور اس نے یہ بتایا تھا کہ آپ غلطی سے اس کا سوٹ لے آئے ہیں۔"

"ہاں!" ظہور نے کانپ کر کہا۔

"تو پھر آپ نے اسے اس کا سوٹ کیوں نہیں دے دیا۔ اور اس سے اپنے والا کیوں نہ لے لیا؟"

"خان صاحب کے ڈر سے، کیونکہ وہ آدمی آج ہی آیا تھا اور اس کی آمد سے پہلے خان صاحب مجھ سے سوٹ لے کر پہن چکے تھے۔ بدلے ہوئے سوٹ کو دیکھ کر وہ پہلے ہی ناراض ہو رہے تھے۔ اب اگر میں ان سے کہتا کہ وہ سوٹ اتار کر دُوسرا پہن لیں، کیونکہ یہ کسی اور کا ہے تو اور مصیبت آتی، لہٰذا میں نے اس سے کہہ دیا کہ اب صاحب سوٹ پہن چکے ہیں اور وہ اتارنا پسند نہیں کریں گے۔ وہ شخص خاموشی سے لوٹ گیا۔"

"اوہ، تو یہ بات تھی۔ اس لیے اس نے کار میں بیٹھ

کر پستول آپ کی گدی سے لگایا۔"

"کیا مطلب ؟" ظہور لرز گیا۔

"چپ رہو۔ کیا مطلب کیا مطلب کی رٹ لگا رہے ہو، اگر پہلے ہی ساری بات بتا دیتے تو شاید اس وقت ہم الجھنوں کا شکار نہ ہوتے۔" خان رحمان نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

ظہور سہم گیا۔

"اب تم لوگ کس نتیجے پر پہنچے ہو ؟"

"اب اگر وہ آدمی مل جائے جو آپ سے سوٹ اتروا کر لے گیا ہے۔ تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ ویسے ہمارا ا یہ ہے کہ یہ کوئی منشیات کا چکر ہے۔ ہمیں مون لائٹ ٹیکسٹائل ملز کو بھی چیک کرنا پڑے گا، لیکن پہلے آپ خان ڈابر کی دعوت سے نبٹ لیں۔ یوں بھی اس وقت مل میں کوئی ذمے دار آدمی نہیں ملے گا، لہٰذا ہم مل صبح چیک کریں گے۔ چلیے دعوت اڑائیں۔ مسٹر عرفان شیرازی آ چکے ہوں گے۔"

"اوہ ہاں۔ چلو۔"

وہ خان ڈابر کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ خان ڈابر نے ایک بار پھر ان کا استقبال کیا اور بولے:

"عرفان آ چکا ہے اور نہا رہا ہے۔ بس باہر نکلنے ہی

والا ہے۔ اس کے فوراً بعد دعوت شروع ہو جائے گی اور آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"ارے ہاں! وہ سوٹ والے چکر کا کچھ پتا چلا؟"

"ابھی تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔"

"ہو گا کچھ۔ ذہنوں کو الجھانے کی کیا ضرورت ہے۔" خان ڈابر نے اکتا کر کہا۔

عین اسی وقت تالیوں کی آواز گونج اٹھی۔ خان ڈابر کے ہاتھ بھی تالی بجانے لگے، لیکن ان کے ہاتھ جوں کے توں رہے:

"مم۔ میرا بیٹا عرفان شیرازی۔ آپ لوگ اس کے استقبال میں تالیاں نہیں بجائیں گے؟" خان ڈابر نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"نہیں! یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ ہم جا کر ان سے مصافحہ کریں گے۔" محمود نے کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

ابھی تک انھوں نے عرفان شیرازی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ مہمانوں میں گھرا ہوا تھا۔ لہٰذا وہ آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ عرفان شیرازی انھیں نظر آ گیا۔ وہ بہت ہنس مکھ نوجوان تھا۔ لمبے قد کا سڈول جسم کا نوجوان۔

"یہ ۔ یہ ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" محمود، فاروق اور فرزانہ نے خان رحمان کی سرگوشی سنی۔ اس وقت تک خان ڈابر ان سے آگے نکل چکے تھے۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"وہ ۔ وہ ۔ عرفان شیرازی ۔ کے ۔ کے۔"

"فرمائیے ۔ کیا بات ہے۔" انھوں نے مڑ کر خان رحمان کی طرف دیکھا اور پھر چونک اٹھے۔

انھیں خان رحمان کی آنکھوں میں حیرت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آ رہا تھا۔

کیا!!!

انسپکٹر جمشید نے اکرام کو دور سے ہی دیکھ لیا۔ اکرام بھی فوراً ان کی طرف لپکا:

"اس معاملے سے ہمارا کیا تعلق بھئی ۔ متعلقہ تھانہ دیکھ لیتا۔" انھوں نے کہا۔

"سر! متعلقہ تھانے کے سب انسپکٹر نے ہی ہمیں فون کیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے ۔ لاش میں کوئی خاص بات ہے۔"

"جی ۔ جی نہیں ۔ وہ صرف ایک کچلی ہوئی لاش ہے ۔ اور اس میں کوئی خاص بات نہیں۔"

"تب پھر ۔ آخر ہمیں کیوں فون کیا گیا؟"

"آئیے! میں دکھاتا ہوں۔"

سڑک پر بہت لوگ جمع تھے ۔ پولیس نے انھیں کافی دور ہٹا دیا تھا ۔ وہ ان کے درمیان سے گزر کر لاش تک

پہنچ گئے۔ لاش دیکھ کر انسپکٹر جمشید کو چکر سا آ گیا۔ وہ بہت
بُری طرح کچلی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر سے
کوئی بھاری گاڑی گزاری گئی ہو۔

"میں اب بھی نہیں سمجھ سکا بھئی۔ اس میں ہمارے محکمے
کی کیا بات ہے؟"

"اس کی تلاشی لینے پر جیب سے جو کچھ نکلا ہے، ان چیزوں
کو دیکھ لیں۔" اکرام مُسکرایا۔

"اور وہ چیزیں کہاں ہیں؟"

اکرام نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا۔ وہ ایک رومال
میں بندھی چیزیں ان کے پاس لے آیا۔ رومال کو کھولا گیا
تو اس میں چھوٹی موٹی کئی چیزیں تھیں۔ ان چیزوں میں
سنہری رنگ کا ایک کارڈ موجود تھا، اس پر کالے رنگ
کی ایک بلّی کی تصویر تھی۔ نیچے بلیک کیٹ کے الفاظ لکھے
تھے۔ اور ان سے نیچے ہاتھ سے ایک لائن لکھی ہوئی تھی:

"انسپکٹر جمشید کے لیے ایک ناچیز تحفہ۔"

انھوں نے یہ الفاظ پڑھ کر اکرام کی طرف دیکھا:

"کسی نے ہمیں عجیب تحفہ بھیجا ہے۔" وہ بڑبڑائے اور
باقی چیزوں کو دیکھنے لگے۔

ان میں ایک سگریٹ لائٹر، سگریٹ کا ایک پیکٹ،

ایک پنسل تراش اور ننھا سا ایک چاقو شامل تھا۔

"لاش کی تصاویر لی جا چکی ہیں؟"

"جی ہاں! بالکل۔ ہر کام مکمل ہے، صرف آپ کو
ایک نظر دکھانا تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔
اور اخبارات میں اشتہار دے دو۔ کہ ایک لاش ملی ہے،
جس کو شناخت نہیں کیا جا سکا۔ شاید کوئی آ کر اسے
پہچان لے اور ہم اس کے قتل کا سراغ لگانے کے قابل
ہو سکیں۔ کیا سڑک پر خون آلود ٹائروں کے نشانات پائے
گئے؟" انھوں نے کہا۔

"جی نہیں۔ ایسا کوئی نشان نہیں ملا۔"

"تب پھر اس کو کچلا کہیں اور گیا ہے۔ یہاں لا کر
ڈالا گیا ہے۔ تاکہ ہم ٹائروں کے نشانات سے کوئی مدد
نہ لے سکیں۔"

"اور اس جملے کا کیا مطلب ہے۔ آپ کے لیے ایک
ناچیز تحفہ۔" اکرام نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"قاتل نے مجھے چیلنج کیا ہے کہ میں اسے پکڑ کر دکھاؤں۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"اور اکرام! میں ان شاء اللہ اسے پکڑ کر دکھاؤں گا،

وہ بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس نے ایک انسان کے ساتھ ظلم
کیا ہے۔ قتل ہی کرنا تھا تو فائر کر کے اپنا کام نکال
سکتا تھا۔"

"جی ہاں! یہی تو میں کہتا ہوں۔" سب انسپکٹر نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب اس مسئلے میں کل ہی کچھ معلوم ہو
سکے گا۔"

"ایک چیز اور ہے سر۔" اچانک سب انسپکٹر نے کہا۔
یوں لگا جیسے اسے کوئی بھولی بات یاد آگئی ہو۔

"ہاں کہیے!"

"لاش سے کچھ فاصلے پر کسی شخص کو ایک تصویر پڑی ملی
تھی۔ اس نے تصویر اٹھا کر مجھے دے دی تھی۔"

"بھئی لاش کے نیچے تو نہیں تھی نا۔ اس طرح تو
سڑک پر نہ جانے کیا کچھ پڑا مل سکتا ہے۔" اکرام نے کہا۔

"ہاں بالکل۔ اس تصویر سے اس قتل کا بھلا کیا تعلق ہو
سکتا ہے، لیکن پھر بھی تصویر کو دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

سب انسپکٹر نے تصویر ان کی طرف بڑھا دی۔ تصویر
پر نظر ڈالتے ہی ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ اس
کو غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے:

"خان رحمان نے کیا حلیہ بتایا تھا بھلا۔" وہ سوچ میں

ڈوب گئے۔

"جی۔ کیا فرمایا؟"

"اکرام۔ تم نے اس تصویر پر غور نہیں کیا۔ کیا اس شخص
کا حلیہ بالکل وہی نہیں ہے۔ جو محمود نے تمہیں نوٹ کروایا
تھا اور جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ نہ تو ریکارڈ
میں ہے۔ نہ یادداشت میں۔"

"اوہو۔" اکرام نے چونک کر کہا، پھر تصویر کو غور سے
دیکھا اور اچھل پڑا:

"اس کا حلیہ تو بالکل وہی ہے۔" اس نے تیز آواز
میں کہا۔

"لیکن۔ کیا یہ تصویر اس مرنے والے کی ہے۔"
وہ بڑبڑائے۔

"یہ کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس کا تو پورا جسم ٹوٹ پھوٹ
گیا ہے۔" اکرام نے کہا۔

"بے شک ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، لیکن اکرام ایک چیز
ہم ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا قد قد چھوٹا ہے۔ اور خان
رحمان نے بھی چھوٹا قد بتایا تھا۔"

"ہو سکتا ہے، یہ وہی شخص ہو۔"

"تب پھر۔ سوٹ کا یہ ہنگامہ لمبا ہوتا نظر آتا ہے۔

کیونکہ اب مُجرم نے مجھے بھی چیلنج کر ڈالا ہے۔ آؤ اکرام۔
چلیں۔" یہ کہ کر وہ گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

وہ فوری طور پر خان ڈابر کے ہاں پہنچے، لیکن اس
وقت وہ لوگ وہاں نہیں تھے۔ لہٰذا وُہ وہاں سے سیدھے
رضائی کلاتھ ہاؤس پہنچے۔ انسپکٹر جمشید جانتے تھے کہ خان رحمان
اس دکان کے مستقل گاہک ہیں۔ دکان کے مالک نے انھیں
خوف زدہ نظروں سے دیکھا:

"خیر تو ہے جناب۔ ابھی ابھی خان صاحب آپ کے بچّوں
کے ساتھ آئے تھے اور اب آپ آئے ہیں۔"

"اوہ! تو وُہ یہاں سے ہو کر جا چکے ہیں۔ خیر۔ اس
تصویر کو دیکھیے۔"

دکان دار نے تصویر کو غور سے دیکھا اور بولا:

"میں اسے نہیں جانتا۔"

"آپ کے ملازمین کو بھی تصویر دکھانا ہو گی۔"

اس نے سب کو وہیں بُلا لیا۔ ایک ایک نے تصویر کو
دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

اب وہ ہیون ٹیلرز کے ہاں پہنچے۔ انھوں نے بھی
یہی خبر سنائی کہ خان رحمان اور ان کے بچے آئے تھے۔ انھوں
نے تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی:

"اسے پہچانتے ہیں؟"

"یہ۔ یہ تو وہی ہے۔ جس کا سوٹ ظہور صاحب لے
گئے تھے۔ اور ایسا میری غلطی سے ہوا تھا۔"

"اوہ، معاملہ اُلجھتا جا رہا ہے۔ اسرار بڑھتے جا رہے
ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"جی کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔ آؤ بھئی اکرام چلیں۔"

وہ اکرام کے ساتھ پھر خان ڈابر کے ہاں پہنچے۔ اندر
داخل ہوئے تو خان رحمان انھیں حیرت کا بُت بنے نظر
آئے اور محمود، فاروق اور فرزانہ انھیں بوکھلائے ہوئے
انداز میں دیکھ رہے تھے۔

◉

"خیر تو ہے خان رحمان؟"

ان کی آواز سُن کر وہ اس طرح اچھلے جیسے کسی نے بہت
گہری نیند سے جگا دیا ہو۔

"اوہ! آپ آ گئے۔ یہ اچھا ہی ہوا۔" محمود کے منہ سے
نکلا۔

"خیر تو ہے؟" وہ بولے۔

"انکل کسی بات پر اس قدر حیران ہیں کہ ان کے
سے آواز تک نہیں نکل رہی۔"

"کیوں خان رحمان؟"

"ہاں! یہ ٹھیک کہ رہے ہیں۔ لیکن بھئی۔ حیرت
میں تمھاری آنکھوں میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ آج کا دن ہے ہی حیرت
فاروق مسکرایا۔

"پہلے تم بتاؤ جمشید۔ کیوں حیران ہو؟"

"اس تصویر کی طرف دیکھو۔ شاید تم بھی مزید حیران
بغیر نہیں رہ سکو گے۔"

خان رحمان نے جونہی تصویر کی طرف دیکھا۔ زور
سے اچھلے:

"اوہو۔ یہ تو وہی ہے۔ پستول والا۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ کہ یہ پستول والا ہے۔
لیے میں یہ تصویر ہیون ٹیلرز کو دکھانے کے لیے گیا تھا
انھوں نے بھی اسے پہچان لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس شخص نے بھی ایک سوٹ سلنے کے لیے دیا تھا" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

ن وہ سوٹ غلطی سے ظہور کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ شخص
ر سے اپنا سوٹ واپس لینے کے لیے آیا، لیکن ظہور خوف
وجہ سے تم سے ذکر نہ کر سکا۔ اور اس وجہ سے اس
ول والے کو پستول کا سہارا لینا پڑا۔"

"لیکن کیوں! آخر اس سوٹ میں کیا تھا؟" اکرام بولا۔

"پتا نہیں کیا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب ہم اس
کبھی پوچھ بھی نہیں سکتے، کیونکہ اس کی لاش ایک سڑک
ے ملی ہے۔ اور اس طرح ملی ہے کہ کسی گاڑی کے نیچے
سے بری طرح کچل دیا گیا ہے۔"

"اوہ۔ نہیں۔" خان رحمان چلائے۔

"ہاں! اب تم بتاؤ۔ تم پر یہاں حیرت کے پہاڑ
ٹوٹ پڑے ہیں؟"

"جمشید۔ تم عرفان شیرازی کو دیکھ رہے ہو۔ وہ
جوان۔ یہ خان ڈابر کے دوست کے بیٹے ہیں۔ یہی
یرونِ ملک سے آئے ہیں۔ آج کی دعوت انھی کے سلسلے
دی گئی ہے۔ عجیب ترین بات جو میں بتانے چلا ہوں،
وہ یہ ہے کہ ..." خان رحمان کہتے کہتے رک گئے۔

"میرا خیال ہے۔ رکنے کی تو کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"ہاں واقعی۔ رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نوجوان ک
جسم پر اس وقت وہی سوٹ ہے۔ جو۔ جو وہ پستول وا
مجھ سے لے گیا تھا۔"

"کیا!!!"

وہ ایک ساتھ چلائے۔

وہ آئے گا

کتنے ہی لمحات تک وہ عرفان شیرازی اور اس کے سوٹ کو دیکھتے رہے اور ان کی نظریں خان رحمان پر جم گئیں:

"تمھیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی خان رحمان۔"

"غلط فہمی کا اس میں کیا سوال۔" خان رحمان نے بُرا سا منہ بنایا۔

"امکان ہے۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر بتاؤ نا۔ کیا امکان ہے؟" انھوں نے جھلا کر کہا۔

"یہ کہ یہ کپڑا دُنیا کے ہر ملک میں فروخت ہو رہا ہو گا، کیونکہ ایک بین الاقوامی مل کا تیار کردہ ہے۔ اب یہ نوجوان جس ملک سے آیا ہے، وہاں بھی فروخت ہو رہا ہو گا۔ اس نے خریدا اور سوٹ سلوا لیا۔"

"اوہ واقعی۔ مجھ سے تو زبردست بے وقوفی ہونے لگی

تھی۔" خان رحمان دھک سے رہ گئے۔

" دوسری بات ، یہ صاحب تو اس وقت جہاز میں ہوں گے جب تمھارا سوٹ اڑایا گیا۔ اور ایرپورٹ سے یہ بالکل سیدھے یہاں آئے ہیں۔ آخر انھیں لینے کے لیے خان ڈابر کے مینجر گئے ہوئے تھے۔"

" بالکل ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے۔ اس سوٹ والے معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہیے۔" خان رحمان بولے۔

" صرف عرفان کی حد تک۔ ویسے ہم تفتیش جاری رکھیں گے۔" انھوں نے کہا۔

" ہوں ٹھیک ہے۔"

" ارے بھئی! یہ ادھر کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ آپ لوگ آگئے آکر میرے بیٹے عرفان سے کیوں نہیں ملتے۔"

" انھیں سے تو ملنے آئے ہیں۔" خان رحمان نے مسکرا کر کہا اور آگے بڑھے۔

انھوں نے عرفان سے ہاتھ ملایا۔

" آپ کا سفر کیسا رہا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

" جی بہت پُرسکون ، بہت خوش گوار۔"

" آپ کہاں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں؟"

" جی۔ انشارجہ میں۔" اس نے کہا۔

" گویا آپ نے اپنی زندگی کے پورے بیس سال وہاں گزار دیے ، اس دوران آپ ایک بار بھی اپنے وطن نہیں آئے۔"

" جی ہاں! ابا جان مرحوم کی یہی خواہش تھی۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔" عرفان نے کہا۔

" اور آپ لوگوں کو شاید میں بتا ہی چکا ہوں۔ کہ میں اب اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر رہا ہوں۔"

" یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی۔"

" اس طرح یہ کاروبار دو گھرانوں کا نہیں ، ایک کا ہو کر رہ جائے گا۔ میرے بعد یہ پوری انڈسٹری کے دونوں مالک ہوں گے۔" خان ڈابر بولے۔

" آپ نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ اچھا خان ڈابر۔ میرا خیال ہے ، اب ہم چلتے ہیں۔"

" بہت بہت شکریہ۔"

وہ ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکل آئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے خان رحمان بولے:

" نہ جانے کیوں۔ بار بار مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ وہی سوٹ پہنے ہوئے ہے۔"

" بھئی آخر کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ تمھارا سوٹ اڑا کر عرفان کو جا کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اس

کو پہن لو۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"بے شک کوئی وجہ دُور دُور تک نظر نہیں آتی، لیکن اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ یہ وہی سوٹ ہے۔ جمشید آخر تم اس معاملے میں کیوں چھان بین نہیں کرتے۔ کیا تمھارا یہ اُصول نہیں ہے کہ کسی کو بھی شک سے بَری نہ سمجھو۔"

"ہاں! ہمارا یہی اُصول ہے۔ لیکن یہاں یہ اُصول نہیں چلے گا۔ اس لیے کہ..." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

"اس لیے کیا؟" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"پتا نہیں میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ یا مجھے کیا کہنا چاہیے۔"

ان کے انداز میں الجھن تھی۔ آخر انھوں نے کہا:

"خان رحمان۔ ہم اس معاملے میں پوری طرح تحقیق کریں گے، لیکن یہ کام اب صبح ہو گا، کیونکہ سب سے پہلے میں مون لائٹ کے مینجر سے ملنا پسند کروں گا۔ پہلے یہ یقین کر لیا جائے کہ یہ کپڑا انشارجہ میں بھی مل رہا ہے یا نہیں۔"

"چلو خیر۔ یونہی سہی۔"

"اس لاش کا بھی مسئلہ ہے۔ ارے ہاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو آ گئی ہو گی۔ کیوں اکرام؟"

"جی میں ابھی پتا کرتا ہوں۔"

اکرام نے دفتر کے نمبر ڈائل کیے اور پھر دُوسری طرف

کی رپورٹ لے کر ریسیور رکھ دیا:

"رپورٹ آ چکی ہے۔"

"تب پھر ہم دفتر چل رہے ہیں۔"

"ایک بات میں بھی کہنا چاہتا ہوں جمشید۔" ایسے میں پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔

"تو آپ کو روکا کس نے ہے۔"

"کہیں یہ کوئی سمگلنگ کا چکر تو نہیں۔ اس کپڑے کے ذریعے سمگلنگ کی جا رہی ہو۔"

"اس کا امکان ہے۔" انسپکٹر جمشید نے سر ہلایا۔

"مون لائٹ ٹیکسٹائل ملز جا کر ہم اس بات کا بھی جائزہ لیں گے، آپ فکر نہ کریں۔" محمود نے کہا۔

"بہت دیر سے ایک سیاہ کار ہمارے پیچھے ہے۔ کہیں یہ تعاقب تو نہیں کر رہی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے۔" یہ کہ کر خان رحمان نے گاڑی کی رفتار کم کر لی۔ سیاہ کار آگے نکل گئی۔ اور جلد ہی بہت دُور ہو گئی۔

"نہیں بھئی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"لیکن وہ اب بھی ہمیں نظر آ رہی ہے۔" فاروق نے اعتراض کیا۔

"خیر - میں گاڑی ایک اور سڑک پر موڑ لیتا ہوں۔" خان
رحمان بولے -

"ہاں ! اس طرح پورا یقین ہو جائے گا۔"

خان رحمان نے اچانک اپنی گاڑی ایک سڑک پر موڑ
دی - سیاہ کار فوری طور پر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی :

"اب اگر یہ کار پھر پیچھے نظر آئی تو مزا آ جائے گا۔"
محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"تم تو ہر وقت مزے کی تلاش میں رہتے ہو - کبھی تو
مزے کے پیچھے پڑنے سے باز رہا کرو۔" فاروق نے بُرا سا
منہ بنایا -

"اچھا ! یہ بات ہے تو پھر آج کے بعد تم مجھے کبھی مزے
کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑتے نہیں دیکھو گے۔" محمود نے ہنس کر کہا۔

"میرا خیال ہے - وہ آئے گا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کون - سیاہ کار والا۔" خان رحمان چونکے۔

"ہاں اور کون - لیجیے - وہ آ گیا۔"

"بس ٹھیک ہے خان رحمان - سڑک بلاک کر دو - اب
ہم اس سے دو دو باتیں کر کے رہیں گے۔"

خان رحمان نے سڑک بلاک کر دی - سیاہ کار ان کے
نزدیک آ کر رک گئی -

"خیر تو ہے جناب - کیا یہ سڑک آپ کی ذاتی سڑک ہے؟"
کار میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے چلا کر کہا۔

"یہ پورا ملک ہی ہمارا اپنا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"لیکن اس ملک میں صرف آپ نہیں رہتے۔"

"بجا فرمایا - آپ بھی رہتے ہیں - لیکن آپ ہمارے
پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" نوجوان چونکا۔

"آپ بہت دیر سے ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔"

"یہ غلط ہے - بلکہ بالکل غلط ہے۔"

"دیکھیے مسٹر - پہلے آپ ہمارے پیچھے تھے - آخر تنگ آ
کر ہم نے کار کی رفتار کم کر لی - آپ آگے نکل گئے ، لیکن پھر
بھی مناسب فاصلے تک رہے - حالانکہ آپ کو تو نظروں سے اوجھل
ہو جانا چاہیے تھا۔"

"پتا نہیں ، آپ کیا کہ رہے ہیں - نہ تو میں آپ کی کار
کے پیچھے تھا ، نہ آگے نکل کر یکساں فاصلے پر رہنے کی کوشش
کرتا رہا۔"

"اور نہ ہمارے اس سڑک پر مڑنے کے بعد آپ واپس
مڑ کر ادھر آئے - نہ آپ اس وقت سڑک پر موجود ہیں۔"
فاروق نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"اب آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"سُنیے جناب، ہم آپ کی کار کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"کس قانون کی رو سے؟"

"ہمارا تعلق محکمہ سُراغ رسانی سے ہے۔ اور ہم آپ کی کار کی تلاشی لے سکتے ہیں۔"

"وارنٹ دکھائیے۔"

"بھئی اتنے لمبے چوڑے چکر کی ضرورت نہیں۔ وارنٹ میں کیا دیر لگتی ہے۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔ لے آئیں وارنٹ۔"

"گویا آپ اس وقت تک یہیں رکے رہیں گے؟"

"پتا نہیں۔ جی چاہا تو رکا رہوں گا۔ ورنہ آپ کو اپنا پتا دے کر آگے بڑھ جاؤں گا۔"

"پہلے تو آپ اپنا پتا دے دیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا، انسپکٹر جمشید نے کارڈ لیا اور پڑھا۔ اس پر عدنان ندیم لکھا تھا، ساتھ ہی لفظ فلم سٹار لکھا تھا:

"اوہ! تو آپ اداکار ہیں۔"

"کیا آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"پتا نہیں، اعتراض ہونا چاہیے یا نہیں۔ بہرحال کارڈ کا شکریہ، اب آپ کار سے نیچے آ جائیں۔ تاکہ ہم تلاشی لے سکیں۔" انھوں نے کہا۔

"اور وارنٹ۔"

"یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ جب چاہیں، وارنٹ لے لیجیے گا۔" وہ مسکرائے۔

آخر نوجوان بُرے بُرے سے مُنہ بناتا نیچے اُتر آیا۔ انھوں نے کار کی تلاشی لی۔ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا مستطیل ڈبا رکھا تھا۔ انھوں نے اس کو بھی اٹھا کر دیکھا:

"یہ کیا ہے؟"

"ٹرانسٹر ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"ذرا چلا کر دکھائیں۔"

نوجوان نے اس کا بٹن آن کر دیا۔ اس سے موسیقی سُنائی دینے لگی۔

"پروفیسر صاحب۔ ذرا اسے دیکھیے۔"

انھوں نے ڈبا لے کر دیکھا۔ چند لمحے تک دیکھتے رہے، پھر بولے:

"کھول کر چیک کرنا پڑے گا۔"

"یہ رسید ہے مسٹر اس ڈبے کی۔ کل دفتر سے آ کر لے جا

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ تلملا اُٹھا۔

"کوئی بات ہوئی ہے یا نہیں ہوئی۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"تم نے اس کی کار کے نمبر نوٹ کر لیے۔" وہ بولے۔

"جی بالکل۔"

انھوں نے راستا چھوڑ دیا، سیاہ کار آگے نکل گئی۔ اس مرتبہ اس کی رفتار اس قدر زیادہ تھی کہ فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایسے میں پروفیسر داؤد چلائے:

"ارے ارے۔ جمشید۔ روکو اسے۔ وہ ہمیں چکر دے گیا۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

ادھر خان رحمان نے کار کی رفتار بڑھا دی، لیکن سیاہ کار کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔

"وہ نکل گیا، لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اس کا کارڈ ہمارے پاس ہے۔ اس پر پتا بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب بات کیا ہے؟"

"بات ذرا دیر سے سمجھ میں آئی۔ اب اس آلے کو کان سے لگا کر دیکھو۔ ہاں بھئی محمود، فاروق اور فرزانہ تم ذرا اپنی بات چیت شروع کر دو۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ بات چیت شروع کر دیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"یوں بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ خان رحمان گاڑی روکنا ذرا۔"

"جی بہتر۔ ویسے آپ کا پروگرام شاید ہم سب کو حیرت زدہ کرنے کا ہے۔"

"ہاں! کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔" وہ مسکرائے۔

انھوں نے گاڑی روک لی:

"جمشید! تم یہ آلہ لے کر کار سے اُتر جاؤ۔ اور ذرا دُور چلے جاؤ۔ اتنی دُور کہ کار میں ہونے والی بات چیت سنائی نہ دے، پھر تم اس آلے کو کان سے لگا لینا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔ اور پھر کار سے نکل گئے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں انکل؟"

"تم لوگوں کو حیران کر رہا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"بہت بہتر! اگر آپ کی خواہش یہ ہے تو پھر ہم آپ کو اس قدر حیران ہو کر دکھائیں گے کہ کیا کبھی حیران

ہوئے ہوں گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

اسی وقت انھوں نے انسپکٹر جمشید کو واپس آتے دیکھا، ان کے چہرے پر حیرت ہی حیرت تھی۔

"وہ نوجوان تو واقعی اداکار نکلا۔ مجھے بھی دھوکا دے گیا۔" انھوں نے کہا۔

"تو وہ اپنی کار میں بیٹھا ہماری بات چیت سُن رہا تھا۔"

"ہاں! اس آلے کا دوسرا حصّہ وہ ہماری گاڑی کے کسی حصّے پر پہلے ہی چپکا چکا تھا۔"

انھوں نے گاڑی کا جائزہ لیا۔ گاڑی کے نیچے ایک سیاہ رنگ کا بٹن سا چپکا ہوا تھا۔ انھوں نے اسے اتار لیا:

"کیا خیال ہے۔ اسی وقت اس پتے پر کیوں نہ چلیں۔" محمود نے کہا۔

"ہاں! یہ بہت ضروری ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ کارڈ پر لکھے پتے پر پہنچے۔ دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھولا:

"جی فرمائیے۔"

"ہمیں عدنان ندیم صاحب سے ملنا ہے۔"

"اُف مالک۔ میں تنگ آ گیا ہوں۔" اس نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"ارے ارے۔ کیا ہوا جناب؟"

"پتا نہیں، کون کم بخت ہے۔ جس نے میرے پتے کا کارڈ بنوا لیا ہے۔ پہلے بھی کئی آدمی یہاں آ کر عدنان ندیم کو پوچھ چکے ہیں۔ جب کہ یہاں میں رہتا ہوں اور میرا کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔ میرا نام رضوان کریم ہے جناب۔ آپ بے شک میرے پڑوسیوں سے پوچھ لیجیے۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔ ویسے ہم اس نوجوان کو تلاش کر لیں گے۔ اس کی کار کا نمبر ہمارے پاس ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی۔ کر چکے تلاش۔ کیا وہ فراڈ ہے۔ اس نے کار کے نمبر بھی بدل ڈالے ہوں گے۔ اوّل تو وہ کار اس کی ہے ہی نہیں۔" رضوان کریم نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"آپ یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"میرا اندازہ تو یہی ہے جناب۔"

"خیر، ہم دیکھ لیں گے، ہماری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی۔"

اب انھوں نے رجسٹریشن آفس کو فون کیا اور کار کے نمبر بتا کر بولے:

"جلد از جلد اس کار نمبر کا پتا بتایا جائے۔"

"جی بہتر۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر چند منٹ

بعد فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے پتا لکھوا دیا گیا، لیکن
یہ پتا بھی عدنان ندیم کا نہیں تھا۔ کسی فرمان علی خان کا
تھا۔ وہ اس پتے پر پہنچے۔ دستک دی تو ایک چالیس
سال عمر کے قریب آدمی باہر نکلا۔ وہ بہت موٹا تھا۔
"ہاں جناب! کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے ہانپتے
ہوئے کہا۔
"مشکل ہے جناب۔" فاروق بول اٹھا۔
"جی۔ کیا مطلب۔ کیا مشکل ہے؟"
"یہ کہ آپ ہماری کوئی خدمت کر سکیں۔"
انسپکٹر جمشید کو ہنسی آ گئی، پھر انھوں نے غصیلے انداز
میں کہا:
"فاروق کیا بدتمیزی ہے۔ ہاں جناب۔ ہمیں عدنان ندیم
سے ملنا ہے۔"
"یہ کون صاحب ہے۔ میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں
جانتا۔" اس نے کہا۔
"کیا آپ کے پاس کوئی کار ہے؟"
"کار۔ کہاں جی۔ میں تو ملازم پیشہ آدمی ہوں۔ آج
ملازم پیشہ لوگوں کے پاس کار نہیں ہوتی۔ وہ بے چارے
تو بے کار ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے جناب۔ ہم بے

لنڈورے ہی بھلے۔ یعنی بے کار ہی بھلے۔" اس نے جلدی
جلدی کہا۔
"آپ کا مطلب ہے۔ یہاں عدنان ندیم نامی کوئی صاحب
نہیں رہتے اور نہ آپ اس نام کے کسی آدمی کو جانتے ہیں،
جب کہ آپ کے پتے پر ایک عدد کار رجسٹرڈ کرائی ہوئی
ہے اور کرانے والے ہیں عدنان ندیم۔"
"یہ بات میرے لیے حیرت انگیز ہے، لیکن میں اس
بات سے بالکل بے خبر ہوں۔"
"ہوں! ہم سمجھ گئے۔ اس چکر باز نوجوان نے ایسا
اس لیے کر رکھا تھا کہ اس کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔
لیکن ہم اب اس کا سراغ لگا کر رہیں گے۔ وہ بھی کیا یاد
کرے گا۔ کس رئیس سے ملاقات ہوئی تھی۔"
"آپ جانیں آپ کا کام جناب۔" اس نے کہا۔
"شکریہ! ہم نے آپ کو زحمت دی۔"
وہ باہر نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے:
"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے ہماری بات چیت سننے
کی ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس
سوٹ کا چکر بہت گہرا ہے اور کوئی یہ نہیں چاہتا کہ ہم اس
معاملے میں دلچسپی لیں؛ تاہم اسے فکر بہت ہے اور وہ یہ

جاننا چاہتا ہے کہ ہم اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں یا کیا کر
کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"اور افسوس کی بات یہ کہ ہمیں ایک سُراغ ملنے لگا
یا یُوں کہہ لیں کہ ایک کام کا آدمی ہاتھ آ گیا تھا، لیکن
نے اسے بھی کھو دیا۔"

"ہاں! اس کا افسوس مجھے بھی ہے، لیکن اس میں
کیا قصور۔"

"اب گھر چلتے ہیں۔ صبح مون لائٹ ملز چلیں گے
امید ہے، اس معاملے کا سُراغ وہاں سے ملے گا۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔

وہ گھر پہنچے۔ پروفیسر داؤد اور خان رحمان بھی ان کے
ہی آ گئے تھے، ابھی آرام کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ
کی گھنٹی بجی:

"ہیلو سر۔ مُردہ خانے سے کچلی ہوئی لاش غائب ہے۔"

"کیا!!!" وُہ چلا اُٹھے۔

زنجیر

مُردہ خانے کے باہر پولیس موجود تھی۔ اکرام بھی وہاں موجود تھا:

"یہ کیسے ہوا؟" انسپکٹر جمشید نے ناخوش گوار لہجے میں پُوچھا۔

"کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس مردے کو چرانے کی کوئی کوشش ہو سکتی ہے، کیونکہ قاتل تو خود اسے سڑک پر چھوڑ کر گئے تھے، اگر اس لاش کی کوئی اہمیت ہوتی تو وُہ چھوڑ کر ہی کیوں جاتے، لہٰذا اس کے لیے کوئی خاص حکم تو دیا نہیں گیا تھا۔ بس ایک ایمبولینس آئی اور لاش اٹھا کر لے گئی۔ ڈیوٹی پر صرف ایک آدمی موجود تھا، اسے وہ زخمی کر گئے ہیں، جو بے ہوش ملا تھا، ہوش میں آنے پر اس نے ایمبولینس والی بات بتائی ہے۔"

"لیکن اب ہماری کس قدر بے عزتی ہو گی، یہ بھی تو سوچو۔ ہم اخبارات میں اشتہار دے چکے ہیں، اخبارات

اب تک چھپ بھی چکے ہوں گے ۔ اشتہار رکوایا بھی نہیں جا
سکتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

ان کے سر جھک گئے ۔ اب ہو بھی کیا سکتا تھا، تیر
کمان سے نکل چکا تھا ۔ مجرم تمام تر سراغ مٹانے پر
تُلا ہوا تھا اور انھیں ابھی تک معاملے کے سر پیر تک کا پتا
نہیں چل سکا تھا ۔ ڈیوٹی پر موجود شخص بھی کچھ نہ بتا سکا۔

انسپکٹر جمشید مردہ خانے میں داخل ہوئے ۔ انھوں نے
فرش کو غور سے دیکھا ۔ جس میز پر مردے کو لٹایا گیا تھا ۔
اس کو دیکھا ۔ میز کے نیچے انھیں ایک سُنہری رنگ کی زنجیر
پڑی دکھائی دی :

"یہ زنجیر کس کی ہے؟" انھوں نے اسے اُنگلی سے اٹھاتے
ہوئے کہا ۔

انھوں نے نفی میں سر ہلا دیے ۔ گویا زنجیر ان میں
سے کسی کی نہیں تھی ۔

"تب پھر یہ ان میں سے ایک کی ہے ۔ جو مردے کو
اٹھانے آئے تھے ۔ اکرام اس زنجیر کو دیکھو ۔ اس میں ننھا سا
ایک لاکٹ بھی ہے۔"

اکرام نے زنجیر اپنی اُنگلی پر لے لی، پھر چونک کر بولا :

"سر ۔ ہمارے ریکارڈ میں ایک پیشہ ور مجرم کی تصویر

موجود ہے ۔ اس کے گلے میں زنجیر موجود ہے ۔ میرا ذہن کہتا
ہے ۔ یہ وہی تصویر ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر اسی وقت جا کر زنجیر کو اس
سے ملا کر چیک کرو ۔ اور مجھے فون پر اطلاع دو۔" انھوں
نے کہا ۔

اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے ۔ گھر پہنچے تو فون کی
گھنٹی بج رہی تھی ، انھوں نے ریسیور اٹھایا ۔ دوسری طرف
اکرام ہی تھا :

"میرا اندازہ درست نکلا سر ۔ زنجیر اسی کی ہے۔"

"اس کا نام پتا؟"

"میں آ رہا ہوں سر ۔ میں آپ کو اس تک لے چلوں گا،
آپ اکیلے نہ جائیں۔"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"وہ بہت بدتمیز ہے۔"

"تو مجھے تمیز سکھانے کا طریقہ آتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر، لیکن آپ مجھے ساتھ لے چلیں۔"
اس نے درخواست کی ۔

"اچھا ٹھیک ہے۔"

جلد ہی اکرام ان کے پاس پہنچ گیا ۔ اور وہ اس کے

ساتھ روانہ ہوئے :

" اس کا نام کیا ہے بھئی ؟"

" وہ امیر کالا کہلاتا ہے۔"

" اوہو ! اس کا نام تو میں نے بھی کئی بار سنا ہے۔
سنا ہے کسی ہوٹل کا مالک بھی ہے۔"

" جی ہاں ! اور وہ ہوٹل سارے شہر کے غنڈوں کا
اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔"

" اور ہوٹل کا نام ہے - سرخاب ہوٹل۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" اوہو ! آپ کو تو معلوم ہے۔"

" بھئی اب میں اتنا بھی بے خبر نہیں۔" وہ مسکرائے۔

جلد ہی وہ ہوٹل سرخاب کے سامنے پہنچ گئے، لیکن
انھیں دروازے پر ہی روک لیا گیا :

" آپ بغیر کارڈ کے اندر نہیں جا سکتے جناب۔"

" کیسے کارڈ ؟" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

" ہوٹل کے کارڈ - جو ہم اپنے گاہکوں کو جاری کرتے ہیں۔"

" افسوس ! ہم اس ہوٹل کے گاہک نہیں ہیں۔"

" تب پھر آپ باہر والے کیبن میں ٹھہریں - کارڈ بنوانے
کی شرائط پوری کریں۔"

" لیکن ہم گاہک بننا نہیں چاہتے - صرف مسٹر امیر کالا

سے ملنا چاہتے ہیں۔"

" وہ نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

" کہاں ملیں گے ؟"

" معلوم نہیں۔"

" اچھا تو پھر ہم اندر داخل ہو رہے ہیں، تم روک سکتے
ہو تو روک لو۔"

" ایک منٹ سر - میں اسی لیے تو ساتھ آیا ہوں - میرے
ساتھ آئیں۔" ایسے میں اکرام آگے بڑھا۔

" کیوں، کیا بات ہے ؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

" میں طریقہ جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔

وہ اس کے ساتھ پیچھے ہٹ آئے - ایک چکر کاٹ کر
وہ ہوٹل کے پچھلے حصے میں آئے - یہاں ایک دروازہ موجود
تھا - اور کوئی نگران وغیرہ نہیں تھا - اکرام اندر داخل ہو
گیا - دائیں طرف ایک کمرہ نظر آیا - اس کمرے کے علاوہ
ہوٹل کے اندر جانے کا کوئی اور راستا نہیں تھا - وہ
اس کمرے کی طرف بڑھا - دروازے پر تالا لگا ہوا
تھا - اکرام نے اپنی چابیوں میں سے ایک چابی کے
ذریعے تالا کھولا اور کمرے میں داخل ہوا - اب ان کے
سامنے دیوار تھی - کمرے میں کوئی دروازہ نہیں تھا -

"یہ کیا۔ یہاں تو کوئی دروازہ نہیں ہے۔"

"فکر کی ضرورت نہیں، دروازہ خود بخود کھُلے گا۔" اکرام نے مسکرا کر کہا۔

"آخر کیسے، آپ کو یہ سب باتیں کس طرح معلوم ہیں انکل؟"

"میں ایک مرتبہ ایک ذمے دار غنڈے کا تعاقب کرتا ہوا اس طرف سے ہوٹل میں داخل ہوا تھا، لیکن جب میں اندر اس غنڈے کو تلاش نہ کر سکا تو خاموشی سے اسی راستے سے لوٹ گیا تھا، کسی پر میں نے ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں نے یہ راستا دیکھ لیا ہے، اب ایک عام آدمی تو اس کمرے میں دوسری طرف کوئی دروازہ نہ پا کر فوراً واپس چلا جائے گا۔"

"ہوں، لیکن خود بخود دروازہ کیوں کھلے گا؟"

"کمرے میں جب کوئی داخل ہوتا ہے اور وہ پندرہ منٹ تک یہاں ٹھہرا رہتا ہے تو اندر ڈیوٹی پر موجود آدمی کو پتا چل جاتا ہے کہ کوئی مستقل آدمی کمرے میں آیا بیٹھا ہے، لہٰذا وہ دروازہ کھول دیتا ہے اور جونہی وہ ہوٹل میں داخل ہوتا ہے، دروازہ پھر سے بند کر دیا جاتا ہے۔"

"اور واپس کوئی کس طرح آ سکتا ہے؟"

"اس کے دوسری طرف بھی اسی طرح کا ایک کمرہ ہے۔ اس راستے سے واپس جانے والے اس کمرے میں پندرہ منٹ ٹھہرتے ہیں۔ دراصل یہ نظام انھوں نے ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے لیے جاری کیا ہے۔ جن کی تلاش میں پولیس ہوتی ہے۔"

"ہوں، لیکن پندرہ منٹ تو بہت زیادہ وقفہ ہے۔ پولیس والے تو اتنی دیر میں آ کر کمرے سے بھی گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"ان کمروں کے بارے میں پولیس کو کچھ معلوم نہیں، دوسرے یہ کہ جب پولیس کا خطرہ ہوتا ہے تو اس وقت کوئی ان میں کیوں آ کر بیٹھے گا۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ ہمیں کیا۔ ہمیں تو اندر جانا ہے اور مسٹر امیر کالا سے مُلاقات کرنا ہے، کیونکہ اس کی زنجیر مُردہ خانے سے ملی ہے۔ ہمیں اس سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ بھائی۔ آخر تمھیں اس مردے کی ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔" فاروق نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ضرور پوچھیں گے۔ فکر نہ کریں۔" اکرام مسکرایا۔

اور آخر دروازہ کھل گیا اور وہ فوراً اس سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچ گئے، لیکن یہاں بھی دروازہ نظر نہ آیا۔ گویا اب انھیں پھر انتظار کرنا تھا۔

"یہ تو بہت زیادہ صبر آزما طریقہ ہے۔"

"مجبوری ہے۔"

"تو اکرام ہم وارنٹ حاصل کر کے اندر داخل ہو سکتے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"اس صورت میں آپ امیر کالا سے ہرگز ملاقات نہ کر پاتے۔" اکرام بولا۔

"اوہ ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے میرا خیال ہے۔ اس راستے سے بہت کم لوگ آتے جاتے ہیں۔"

"جی ہاں! ضرور یہی بات ہے۔"

"اور دوسری بات یہ کہ ڈیوٹی پر موجود آدمی کو ان کمروں میں کسی کی صرف موجودگی کا پتا چلتا ہے یا وہ اس کی تصویر دیکھتا ہے؟"

"اس بارے میں تو مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں۔ خیال یہی ہے کہ صرف موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ اگر تصویر دیکھی جاتی تو پھر میں اس روز واپس کس طرح جا سکتا تھا۔"

"شاید یہی بات ہے۔"

اچانک دوسرا دروازہ کھل گیا اور وہ اس سے گزر کر ایک برامدے میں آ گئے۔

"ہم یہاں سے سیدھے امیر کالا کے کمرے کی طرف چلیں گے۔" اکرام نے کہا اور ان کے آگے چلنے لگا، کیونکہ انھیں راستا معلوم نہیں تھا۔ دو تین برامدے مڑنے کے بعد اکرام نے ایک دروازے پر رک کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر دروازہ دھکیل ڈالا۔ وہ کھل گیا۔ اکرام فوراً اندر داخل ہو گیا۔ باقی لوگوں نے بھی دیر نہ لگائی۔ اکرام نے ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا۔

اندر موجود شخص چونک کر ان کی طرف مڑا، کیونکہ وہ ان کے اندر داخل ہونے سے پہلے آتش دان کی طرف منہ کیے کھڑا تھا اور آتش دان پر رکھے ایک سیاہ رنگ کے ڈبے کو بند کر رہا تھا:

"کک۔ کیا مطلب؟" اس کے منہ سے نکلا۔ آواز میں حد درجے جھلاہٹ تھی۔

"آپ نے کس بات کا مطلب پوچھا مسٹر امیر کالا؟" اکرام بولا۔

"اوہ۔ سب انسپکٹر اکرام صاحب۔ یہ آپ ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ میں پہلی نظر میں پہچان نہیں سکا۔"

"کوئی بات نہیں، دوسری نظر میں تو پہچان لیا نا۔ اور ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں ۔ میں نے پہلی بار انھیں دیکھا ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں ۔ میں تعارف کرائے دیتا ہوں ۔ یہ انسپکٹر جمشید ہیں اور یہ خان رحمان ، محمود ، فاروق اور فرزانہ ہیں۔" اکرام بولا۔

"نن ۔نہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ نے کیا فرمایا، نہیں ہیں ۔ ضرور ہیں جناب ۔آپ یقین کریں۔" فاروق بولا۔

"مم ۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"خیر۔آپ کا مطاب جو بھی تھا ۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں ۔ اس مُردے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"کس مُردے کے بارے میں ۔ مجھ سے تو آپ صرف زندوں کی بات کریں۔" اس نے منہ بنایا۔

"شاید گھی سیدھی اُنگلیوں سے نہیں نکلے گا۔" محمود بڑبڑایا۔

"کون سا گھی ۔ دیسی یا بناسپتی؟" فاروق نے فوراً کہا۔

"ہاں! یہ مسئلہ بھی ہے ۔ خیر فی الحال دیسی نکال لیتے ہیں۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی ۔ایک منٹ ۔ تمھارے انکل بات کر تو رہے ہیں۔"

"ہاں! یہ بھی ہے۔"

"مسٹر امیر کالا ۔ سرکاری مُردہ خانے میں ایک مُردہ موجود
بگرامی روڈ سے ایک کچلی ہوئی لاش ملی تھی ، پوسٹ
م کے بعد اس کو مردہ خانے میں رکھ دیا گیا تھا ، لیکن
وہ مردہ اس مردہ خانے میں نہیں ہے۔"

"ارے باپ رے ۔ اب مردے بھی چلنے پھرنے لگے۔"
کالا نے گھبرا کر کہا۔

"جی نہیں ۔ لوگ ان کو چلانے پھرانے لگے ۔ اس
ے کو آپ اٹھا کر لائے ہیں ۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں
کیوں اور مُردہ کہاں ہے؟"

"افسوس! نہ تو میں اٹھا کر لایا ہوں ۔ نہ اس مُردے
ے میرا کوئی تعلق ہے۔"

"دیکھا آپ نے ۔ میرا تو پہلے ہی یہ خیال تھا کہ
ے بارے امیر کالا بھلا کیوں مردے سے دوستی گانٹھنے
۔ان سے دوستی کرنے والے زندہ کیا مر گئے۔" فاروق
جلدی جلدی کہا۔

"کیا اوٹ پٹانگ بولے جا رہے ہو ۔ تم تھوڑی دیر
پ نہیں رہ سکتے؟" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"بہت بہتر ۔ میں نہیں بولوں گا۔" فاروق نے بُرا سا
ز بنایا۔

" مسٹر امیر کالا۔ آپ اس زنجیر کو پہچانتے ہیں "؟ اکرا
نے زنجیر جیب سے نکال کر اس کی آنکھوں کے سام
لہرائی۔

پھر انھیں یوں لگا جیسے اس کمرے میں زلزلہ
گیا ہو۔

بڑا خطرہ

امیر کالا نے یک دم میز الٹ دی تھی۔ ساتھ ہی چھلانگ
لگا کر الماری کے پیچھے گیا تھا اور دوسرے لمحے لکڑی کی
بھاری الماری ان پر گر پڑی تھی۔ انھوں نے اگر پھرتی سے
کام نہ لیا ہوتا تو ضرور اس کے نیچے دب جاتے۔ اور
جب وہ اِدھر اُدھر ہونے کے بعد سیدھے کھڑے ہوئے تو
امیر کالا غائب تھا :

" ہائیں! یہ حضرت کہاں غائب ہو گئے "؟

" اسی لیے تو میں صدر دروازے سے آپ کو اندر نہیں
لایا تھا"۔ اکرام نے بُرا سا منہ بنایا۔

اب جو انھوں نے الماری کے پیچھے کی دیوار کا جائزہ
لیا تو وہاں ایک دروازہ نظر آیا۔ دروازے کے دوسری
طرف سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آئیں۔ انھوں نے آؤ دیکھا
نہ تاؤ۔ سیڑھیاں اُترنے لگے۔

"ہم خطرہ مول لے رہے ہیں سر۔" اکرام چلّایا۔ وُہ ابھی تک نیچے نہیں اُترا تھا۔

"مجبوری ہے انکل ۔ خطرہ مُفت ملتا ہی نہیں۔" فاروق نے ہانک لگائی۔

مجبوراً اکرام کو بھی اُترنا پڑا۔ جونہی انسپکٹر جمشید نے سب سے نچلی سیڑھی پر پیر رکھا، ایک فائر کی آواز گونجی اور وہ دھم سے گرے۔ ان کے ساتھ ہی باقی بھی نیچے لڑھک گئے۔

"ابا جان! آپ ٹھیک تو ہیں۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔ اس کے ساتھ ہی ایک فائر اور ہوا اور گولی فرزانہ کے سر پر سے گزر گئی۔

"ارے باپ رے۔" فرزانہ کانپ گئی۔

"مسٹر امیر کالا۔ اب آپ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیں، اسی میں آپ کی بہتری ہے۔"

"قانون صرف میری لاش کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔" تہ خانے میں اس کی آواز گونجی۔

"اوہو اچھا! ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اب ہم آپ کی زندگی میں آپ سے یہ مطالبہ نہیں کریں گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"یار تم تھوڑی دیر کے لیے چپ نہیں رہ سکتے۔" انسپکٹر جمشید تلملا اُٹھے۔

"بالکل رہ سکتا ہوں، بلکہ یہ کیا مُشکل کام ہے۔" فارُوق فوراً بولا۔

وہ اس وقت تک اِدھر اُدھر لڑھک کر پوزیشن لے چکے تھے۔ آنے والی دو گولیوں سے انھیں امیر کالا کی سمت کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا۔

"مرنے والا کون تھا مسٹر امیر کالا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اگر یہ باتیں بتانے کے قابل ہوتیں تو میں آپ سے کیوں ٹکراتا۔ بتا کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔"

"گویا تم جانتے ہو۔ لاش کس کی تھی۔"

"بالکل جانتا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ اس شخص کو لاش میں کیوں تبدیل کیا گیا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ جلدی بتاؤ۔ کیوں تبدیل کیا گیا؟" فارُوق چہک اُٹھا۔

"تم پھر بولے۔" انسپکٹر جمشید جھلا اُٹھے۔

"اوہ۔ معاف کیجیے گا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ سوٹ کا کیا چکر ہے مسٹر امیر کالا؟"

"مجھ سے آپ کو کوئی بات معلوم ہو جائے، بس یوں

سمجھ لیں کہ یہ ناممکن ہے۔"

"خیر۔ سمجھ لی یہ بات۔ لیکن آپ نے فائرنگ کا سلسلہ بند کیوں کر دیا؟"

"اب ضرورت نہیں۔ آپ کو پوری طرح گھیر لیا گیا ہے۔ یہ تہ خانہ اب آپ کے لیے چوہے دان ثابت ہو گا۔"

"چوہے دان۔ بھئی واہ۔ تو اب ہم چوہے ہو گئے۔" فاروق بول اٹھا۔

"یہ بات بھی ثابت ہو گئی۔ تم خاموش رہ ہی نہیں سکتے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"پہلی بار ثابت نہیں ہوئی۔ یہ غلط ہے۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"اب تم دونوں بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"مسٹر امیر کالا۔ آپ کسی چوہے دان کی بات کر رہے تھے۔" محمود نے ہانک لگائی۔

لیکن امیر کالا کی آواز انھیں سنائی نہ دی۔

"ہائیں جناب امیر غریب صاحب، آپ کہاں ہیں، آپ کی آواز کو کیا ہوا؟" فاروق نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ وہ نکل گیا۔ محمود اپنی پنسل ٹارچ

نکالنا۔"

محمود نے پنسل ٹارچ روشن کی تو انھیں تہ خانے میں ائی دینے لگا۔ اس وقت تک وہ اندھیرے میں ٹامک ئیاں مارتے رہے تھے۔

"ہائیں! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" خان رحمان بولے۔

"اور اوپر والا دروازہ بھی بند ہو چکا ہے۔" انسپکٹر جمشید ے مسکرا کر کہا۔

"اوہ! اب کیا ہو گا۔" فرزانہ چونکی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہی ہو گا جو اللہ کو منظور ہو گا۔" فاروق مسکرایا۔

"اکرام تم نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے ساتھ لے چلیے، لیکن ئی۔ تمھارے ساتھ آنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھنس ر ہم پھر بھی گئے۔"

"میں نے وہ بات صرف اندر داخل ہونے کی حد تک ہی تھی سر۔" اکرام نے اداس انداز میں کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ امیر کالا نے دو فائر دراصل اس لیے کیے تھے کہ ہم سیڑھیوں کے آس پاس ہی دبکے رہ جائیں اور وہ نکل جائے۔ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر وہ تہ خانے کے دوسرے راستے سے نکل گیا اور اس کے آدمیوں نے اوپر

والا راستا بھی بند کر دیا۔ گویا وہ چاہتا ہے، ہم اندر
تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔"

"تب تو ہمیں دوسرا راستا تلاش کر لینا چاہیے۔" فرزا
جلدی سے بولی۔

ٹارچ کی روشنی میں انھوں نے دوسرے راستے کی تلا
شروع کر دی۔ تہ خانہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ شاید ایسے موقع
کے لیے فرار ہونے کا راستا تھا۔ اس کی دیواروں اور فر
کو ٹھوک بجا کر دیکھنے کے بعد انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف
دیکھا اور بولے:

"کہیں ایسا تو نہیں۔ وہ سیڑھیوں کے ذریعے ہی با
نکل گیا ہو۔"

"پاس سے گزرتے وقت میں اس کے پاؤں کی آہٹ
ضرور سنتی۔ چاہے وہ کتنی ہی احتیاط کر لیتا۔"

"ہوں۔ خیر۔ اس کا مطلب ہے۔ ہم تہ خانے ک
دوسرا راستا تلاش کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ آؤ ایک
پھر فرش اور دیواروں کا جائزہ لے لیں۔ جلدی کرو۔"

"لیکن ابا جان۔ پنسل ٹارچ کا سیل زیادہ دیر تک سا
نہیں دے سکتا۔" محمود بولا۔

"اسی لیے کہ رہا ہوں۔ جلدی کرو۔"

انھوں نے کہا اور فرش کو بغور دیکھنے لگے۔ محمود، فاروق،
فرزانہ اور اکرام ایک ایک دیوار کا جائزہ لینے لگے۔ خان رحمان
سیڑھیوں کے آس پاس دیکھ رہے تھے۔ اچانک انھوں نے
کہا:

"بھئی جمشید! راستا مل گیا۔ امیر کالا نے ہم سے چال چلی تھی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"یہ دیکھو۔ سیڑھیوں کے نیچے راستا موجود ہے۔ اس
طرف ہم نے دیکھا تک نہیں۔"

وہ اس طرف لپکے۔ سیڑھیوں کے نیچے ایک بالکل ننھا
سا کمرہ اور تھا۔ اس میں چونکہ کوئی دروازہ نہیں تھا، اس
لیے وہ اس کو زینے کے نیچے کی خالی جگہ سمجھے تھے اور
اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ دوسری بات یہ کہ امیر کالا
کی آواز اس کے بالکل دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ فائر
کرنے کے بعد اس نے چند باتیں کیں اور پھر فرش پر رینگ
کر زینے کے نیچے اس ننھے سے کمرے میں آ گیا۔ اس
کمرے کے فرش میں ایک چوکور خلا تھا۔ اس خلا کے نیچے
صرف اتنی جگہ تھی کہ ایک آدمی رینگ کر نیچے جا سکتا تھا،
لیکن یہ خلا ٹارچ کی روشنی میں اس وقت تک نظر نہیں آ
سکتا تھا، جب تک کہ اس میں اتر کر ٹارچ کی لائٹ نہ ماری

جاتی۔ انھوں نے اوپر رہ کر ٹارچ کی روشنی اس میں ضرور
ڈالی تھی۔ اندر داخل ہو کر ایسا کرنے کی ضرورت محسوس
نہیں کی تھی، لیکن یہ خیال خان رحمان کو آ گیا۔ وہ اس چوکور
خانے میں اُتر گئے اور ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا، کیونکہ ٹارچ
تو انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں تھی۔

"خان رحمان نے میدان مار لیا۔ پہلے میں رینگ رہا
ہوں۔ ٹارچ بھی میرے پاس ہے، اگر کوئی خطرہ نہ ہوا
تو میں اشارہ دوں گا اور خطرہ ہوا تو خود واپس آ جاؤں
گا۔ اللہ حافظ۔"

یہ کہ کر وہ خلا میں رینگ گئے۔

"اللہ حافظ۔" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

اب وہ گھپ اندھیرے میں کھڑے تھے۔ ایسے میں اوپر
کی طرف سے دھم سے کوئی چیز گرنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ
ہی کسی نے کہا:

"ہاں بہا دو پٹرول۔"

یہ جملہ بہت خوف ناک تھا۔ امیر کالا کے ساتھی تہ خانے
میں پٹرول بہا کر آگ لگا دینا چاہتے تھے تاکہ وہ جل کر
بھسم ہو جائیں۔

"اب ہم یہاں مزید نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں اس خلا

میں رینگنا ہو گا۔"

"اور اگر اس طرف بھی خطرہ ہوا۔"

"دیکھنا یہ ہے کہ بڑا خطرہ کس جگہ ہے۔ یہاں یا خلا
کے دوسری طرف۔" خان رحمان نے جلدی سے کہا۔

"اگر آگ لگا دی گئی تو پھر ہم تہ خانے میں سانس
ہرگز نہیں لے سکیں گے۔ لہٰذا رینگ کر باہر نکلنے کی کوشش
کرنا بہتر رہے گا۔"

"تو پھر آؤ۔ بسم اللہ کریں۔" محمود نے کہا۔

وہ باری باری اس خلا میں اترنے لگے۔ سب سے آگے
خان رحمان تھے اور سب سے آخر میں اکرام۔ اس وقت اکرام
نے پٹرول کی بُو محسوس کی:

"انھوں نے پٹرول انڈیل دیا ہے۔" اکرام چلایا۔

"آپ بھی آ جائیں انکل۔" فاروق نے فوراً کہا۔

اور اکرام بھی خلا میں رینگ گیا۔ ٹارچ چونکہ سب
سے آگے تھی، اس لیے اس تک روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔
یوں بھی روشنی کا رُخ آگے کی طرف تھا۔

"شاید آج ہم بہت بُرے پھنسے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"لیجیے۔ یہ محترمہ ابھی شاید کہ رہی ہیں۔ گویا ابھی تک
انھیں یقین نہیں آیا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بہت زیادہ جلے بھنے ہو شاید۔ حالانکہ گھبرانے، جلنے اور بھننے سے کبھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔"

"تو یہ بات تم اپنی جوتی کو کیوں نہیں سمجھاتیں"۔ فاروق نے فوراً کہا۔

"بہت خوب!" محمود ہنس پڑا۔

"کمال ہے۔ تم اس رینگنے کی حد تک سرنگ میں بھی اس قسم کی باتیں کر سکتے ہو۔ کمال ہے۔" خان رحمان بولے۔

"کیا کریں انکل مجبوری ہے۔"

"ہائیں کیا۔ کیا مجبوری ہے؟" خان رحمان حیران رہ گئے۔

اسی وقت ایک آواز نے ان کا رینگنا بند کر دیا:

"یہ کیا بھئی۔ میں نے تو تم لوگوں کو وہیں رکنے کے لیے کہا تھا اور ابھی تک میری طرف سے تمھیں اشارہ بھی نہیں ملا، پھر تم کیوں رینگ آئے ہو؟"

آواز انسپکٹر جمشید کی تھی۔

"اس طرف۔ انھوں نے تہ خانے میں پٹرول پھینک دیا ہے۔ اور غالباً اب تک تو انھوں نے پٹرول کو آگ بھی دکھا دی ہو گی۔"

"اوہ! تو وہ اس حد تک اُتر آیا ہے۔ خیر۔" انھوں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"خیر تو ہے ابا جان۔ آپ ابھی تک یہیں پہنچے ہیں یا لوٹ کر آ رہے ہیں؟"

"لوٹ کر آ رہا ہوں۔ اس سُرنگ کے سرے پر خطرہ ہی خطرہ ہے۔ میں نے اس کو سُرنگ کہہ کر غلطی تو نہیں کی۔" وہ بولے۔

"جی نہیں، اب ہم اسے اور کیا کہیں، لیکن یہ ہے ذرا لیٹویں سرنگ۔ لیٹ کر رینگنا پڑ رہا ہے۔" وہ بولے۔

"خیر۔ اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ ہمارے لیے خطرہ کس طرف کم ہے۔"

"تم لوگوں نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی۔ وہ کس بات پر؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے یہ سُن لو کہ سرنگ کے دوسری طرف کیا خطرات ہیں۔ اگر ہم نے اس طرف سے نکلنے کی کوشش کی تو گولیوں کی بوچھاڑ ہمارا استقبال کرے گی۔ یہ ہوٹل ایک خوفناک جنگل کے کنارے بنایا گیا ہے، اس جنگل میں مُلک بھر کے جرائم پیشہ افراد پناہ لیے ہوئے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"امیر کالا نے ویسے ہی ان لوگوں کو اشارہ کر دیا ہو

گا کہ ان کا ایک دیرینہ دشمن آج اس سرنگ سے نکل کر ان
کے سامنے آنے والا ہے۔ لہٰذا اگلے پچھلے تمام بدلے چکانے
کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"ہوں۔ گویا جرائم پیشہ لوگوں کا ایک پورا لشکر ہماری
گھات میں ہو گا۔ اور اس طرف آگ کا دریا ہے۔" محمود نے
پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں! لیکن میں تمھیں پریشان ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"تو پھر ان حالات میں آپ ہمیں کس بات کی اجازت
دیں گے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیا تم سمجھتے ہو۔ وہ اس تہ خانے کو آگ لگا کر پورے
ہوٹل کو خطرے میں ڈالیں گے۔"

"جی کیا مطلب؟" وہ چونک اُٹھے۔

"یہ ان کی چال تھی۔ امیر کالا عقل سے پیدل انسان نہیں
ہے۔ پٹرول کی بُو سنگھا کر تم لوگوں کو اس طرف سے نکالنے
کا سامان کر ڈالا۔ تاکہ سب کے سب گولیوں سے چھلنی
ہو جائیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"پھر۔ اب کیا پروگرام ہے ابا جان؟"

"واپس چلیں گے بھئی۔ اور کیا کرنا ہے۔ وہ تہ خانے

کو آگ ہرگز نہیں لگائیں گے۔ آؤ۔"

وہ واپس مڑے۔ اب اکرام سب سے آگے تھا۔
آخر وہ سُرنگ کے سِرے تک پہنچ گئے۔ ایسے میں اکرام
کی آواز ابھری:

"اوہ! یہ۔ یہ کیا۔"

"کیا ہوا بھئی؟"

"راستا بند کر دیا گیا ہے۔ وہ چوکور خلا اب پتھروں
سے پُر کر دیا گیا ہے۔"

"نہیں!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں! ہم ان پتھروں کو نہ تو سرنگ کے اندر لا سکتے ہیں،
نہ اوپر دھکیل سکتے ہیں۔ کیونکہ نہ سیدھا ہاتھ پڑے گا، نہ ان
پر زور لگے گا۔ گویا اس طرف سے نکلنا قریب قریب
ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔"

"ہوں! اس کا مطلب ہے۔ اب ہمیں واپس جانا ہو
گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! مجبوری ہے۔" اکرام نے کہا۔

"خیر۔ آؤ۔ دیکھا جائے گا۔" انھوں نے اپنے خاص انداز
میں کہا۔

وہ واپس مڑے۔ اب پھر انسپکٹر جمشید سب سے آگے

تھے ۔ عین اس وقت ٹارچ کا سیل جواب دے گیا اور
وہ گھپ اندھیرے میں نہا گئے ۔

" اندھیرے کے مسافر " محمود بڑبڑایا

" بہت خوب ! یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے " فاروق
نے کہا ۔

" لیجیے ۔ اس اندھیرے میں ، اور اندھیرے میں ڈوبی
سرنگ میں جس کا ایک دروازہ بھی بند ہو چکا ہے ، انھیں
ناولوں کے ناموں کی سوجھ رہی ہے "

" اور ہم کیا کریں ۔ اس سرنگ میں کرنے کے لیے
اور رکھا کیا ہے "

" آہا ۔ میں گولیوں کی تڑا تڑ سن رہا ہوں " انسپکٹر جمشید
نے کہا ۔

" گویا سرنگ کے باہر ہمارے استقبال کی تیاریاں مکمل
ہو چکی ہیں "

" ہم بغیر کسی تیاری کے اس طرف آ گئے ۔ اکرام نے
خبردار بھی کیا تھا ، لیکن ہم نے توجہ نہیں دی ۔ ورنہ اس
صورتِ حال سے دو چار نہ ہوتے " خان رحمان بولے ۔

" اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ، ہمیں اس سرنگ
سے بہر حال باہر نکلنا ہے "

وہ مسلسل رینگتے رہے ۔ یہاں تک کہ سرنگ میں راستا
دکھائی دینے لگا ۔ راستے کے باہر انھیں درخت ہی درخت
لہلہاتے نظر آئے ۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ختم ہو چکی تھی اور
ہر سکون ہی سکون محسوس ہو رہا تھا ۔

" اس سکون سے مجھے بہت خوف محسوس ہو رہا ہے " جمشید
خان رحمان نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا ۔

" ہاں خان رحمان ! بات واقعی خوفناک ہے ، لیکن ہم ڈر
کر کیا کر لیں گے ۔ موت کا ایک دن مقرر ہے ، موت اس
دن آ کر رہے گی ۔ اگر ہماری موت آ چکی ہے ۔ تو ٹل
نہیں سکتی ۔ لہٰذا ہمیں چاہیے ۔ اللہ کو یاد کریں ۔ اسی سے
مدد مانگیں ۔ اس لیے کہ حاجت روا اس کے سوا کوئی نہیں ،
مالک و مختار اس کے سوا کوئی نہیں ۔ خود اس کا اپنے
کلام پاک میں ارشاد ہے ۔ مجھے پکارا کرو ۔ میں تمھاری
دعا اور پکار کو سنتا ہوں ۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ کو
چھوڑ کر پہلے اللہ کے پیاروں کو پکارنا ضروری ہے ۔ تو
وہ اللہ پر سے بھروسہ اٹھ جانے کی بات ہو گی ۔ لہٰذا ہم
تو بھئی صرف اور صرف ایک اللہ کو پکاریں گے ۔ مل کر
پکارو ۔ یا اللہ "

" یا اللہ " ان سب نے کہا ۔

اور پھر آگے بڑھے۔ انسپکٹر جمشید عین سرنگ کے منہ
تک پہنچ گئے۔ انھوں نے سامنے دیکھا، دائیں اور بائیں
دیکھا۔ دُور دُور تک کوئی دشمن نظر نہیں آ رہا تھا:

"وہ سب کے سب درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں
اس طرح کہ ذرا بھی نظر نہیں آ رہے۔" اِنسپکٹر جمشید نے
سرگوشی کی۔

"گویا جونہی ہم باہر نکلیں گے۔ وہ یک دم ہم پر
حملہ کر دیں گے۔"

"ہاں بالکل۔"

"لیکن ہم بھوکے پیاسے اس سرنگ میں کب تک رہ
سکیں گے۔"

"ہمیں رہنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ہم باہر نکلیں
گے۔ زندہ رہیں گے یا مَوت سے ملاقات کر لیں گے،
اللہ کو معلوم ہے۔ لیکن ہم دشمنوں کے لیے تَر نوالہ نہیں
ثابت ہوں گے۔ ہم انھیں بھی ناکوں چنے چبوا کر رہیں
گے۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

"بہت خوب۔ یہ ہوئی نا بات۔ مرنا ہے تو پھر
بہادری سے لڑتے ہوئے اور دشمنوں کے کشتوں کے پشتے
لگاتے ہوئے کیوں نہ مریں۔" خان رحمان نے خوش ہو

کر کہا۔

"لیکن ہمارے پاس تو صرف چند پستول اور چند گولیاں
ہوں گی۔" اکرام نے کہا۔

"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔" محمود گنگنایا۔

"میں ایک پستول ہاتھ میں لے کر اکیلا باہر نکلنے لگا ہوں،
پہلے اندازہ ہو جائے کہ باہر کیا کچھ سامان کیا گیا ہے، پھر میں
نھیں باہر نکلنے کا اشارہ دوں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" محمود نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے پستول ہاتھ میں لیا اور اللہ کا نام لے
کر باہر نکلے۔ انھیں کسی طرف بھی کہیں خطرہ محسوس نہ ہوا۔
وہ زمین پر رینگتے ہوئے کافی دور نکل آئے، لیکن ان پر
کسی طرف سے بھی حملہ نہیں کیا گیا۔ وہ حیران رہ گئے۔
یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ انھیں اس قدر آرام سے نکلنے دیا جاتا،
جب کہ دُوسری طرف راستا بالکل بند کر دیا گیا تھا اور
اس طرف بھی وہ تھوڑی دیر پہلے تک فائرنگ کی آوازیں
سنتے رہے تھے۔

حیرت زدہ سے وہ آگے بڑھے اور پھر کئی درختوں
کے پیچھے جا جا کر دیکھا، لیکن کوئی بھی دشمن ان درختوں
کے پیچھے چھپا ہوا نظر نہ آیا۔ آخر انھوں نے اُتو کی

آواز نکالی۔

دُور سے انھوں نے اپنے ساتھیوں کو سرنگ سے نکلتے دیکھا۔ اور پھر ان کی سٹی گم ہو گئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور مُنہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔

خُون کے پیاسے

اُلّو کی آواز نکالنے کے فوراً بعد ان کی نظریں چند درختوں کے اوپر اٹھ گئی تھیں۔ اور پھر انھوں نے ان درختوں میں چھپے بے شمار دشمنوں کو دیکھ لیا تھا۔ یہ دشمن پہلے انھیں نظر نہیں آئے تھے۔ نہ ہی انھوں نے اوپر دیکھا تھا۔ وہ تو اسی خیال میں رہے تھے کہ دشمن درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔

ان کے لیے پریشانی کی بات یہ تھی کہ ان لوگوں نے خود کو بہت زبردست طریقے سے درختوں کے اندر چھپایا تھا۔ عام آدمی تو ان کے بارے میں یہ جان بھی نہیں سکتا تھا۔ انھیں بھی دشمن ابھی تک نظر نہیں آئے تھے۔ ان کی نظریں تو چند پرندوں پر پڑی تھیں۔ ان پرندوں کی آنکھوں میں حد درجے خوف تھا۔ اور اڑنے کے لیے اس طرح پَر تولے بیٹھے تھے کہ اب اڑے،

لیکن شاید ان کے گھونسلوں میں ان کے بچّے موجود تھے۔ جس
وجہ سے اڑ جانا نہیں چاہتے تھے۔

اس قسم کے پرندوں کو دیکھنے کا ان کا بہت پرانا
تجربہ تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ادھر وہ ان میں سے
کسی ایک کو یا چند ایک کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے، ادھر ان
پر چاروں طرف سے گولیاں برسا دی جاتیں۔ اپنے ساتھیوں کو
وہ باہر نکل آنے کا اشارہ دے ہی چکے تھے۔ اب وہ انھیں
یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ واپس سرنگ میں چلے جاؤ —
کیونکہ یہ اشارہ طے نہیں تھا اور ان کے لیے اور بھی زیادہ خطرناک
ثابت ہو سکتا تھا۔

گویا وہ سب کے سب موت کے دہانے پر تھے۔
انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ
گئے۔ یہ آنسو موت کے خوف سے نہیں آئے تھے۔ بلکہ
بیگم جمشید کا خیال آ جانے پر آئے تھے، پھر وہ مسکرا دیے،
انھوں نے سوچا۔ اللہ سے ملاقات ہو گی۔ ان کے ساتھی
اب سرنگ سے نکل کر ان کی طرف آ رہے تھے۔ وہ
ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے، لیکن وہ ابھی خطرے سے
بے خبر تھے۔ آخر وہ ان کے بالکل نزدیک آ گئے:

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے ابا جان؟" محمود کے لہجے

میں حیرت تھی۔

"کیا کس طرح ہو سکتا ہے؟" انھوں نے بے خیالی کے
عالم میں پوچھا۔

"دشمنوں نے ہمیں زندہ کس طرح نکلنے دیا؟"

"ہاں! یہ واقعی نہیں ہو سکتا۔" وہ بولے۔

"تو پھر..." فرزانہ جلدی سے بولی۔

"دشمن ہمارے چاروں طرف موجود ہے۔ اور ہم اس کی
زد پر ہیں۔"

"کیا واقعی؟" خان رحمان چونک اٹھے۔

"ہاں خان رحمان۔ ان میں سے نہ جانے کتنے درختوں
میں وہ چھپے ہوئے ہیں۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

ان کی نظریں اوپر جم گئیں، لیکن وہ انھیں نظر نہ آئے،
درخت بہت گھنے تھے۔ وہ کہاں کہاں چھپے ہوئے تھے۔
صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ جب کہ وہ
سب ان کے بالکل سامنے تھے اور ایک سیکنڈ میں نشانہ
بن سکتے تھے۔

"آخر یہ لوگ اب کس انتظار میں ہیں؟" فرزانہ نے اُلجھن
کے عالم میں کہا

عین اس وقت ایک طرف سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔
وہ سب اس طرف مڑے۔ انھوں نے دیکھا، وہاں چھ
سات مسلح آدمی کھڑے تھے۔ وہ بہت لمبے تڑنگے تھے،
ان کے ہاتھوں پر لوہے کے مکّے چڑھے ہوئے تھے۔
اسی طرح پیروں میں کیلوں والے جوتے تھے۔

ایک بار پھر دوسری طرف سے ہنسی کی آواز سنائی
دی۔ وہ سب اس طرف مڑے تو اس طرف بھی چند آدمی
کھڑے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چند گرز نما ہتھیار
نظر آئے۔ تیسری مرتبہ ہنسی کی آواز سنائی دی، ادھر تلواریں
لیے آٹھ نو آدمی کھڑے تھے۔ چوتھی سمت میں جدید رائفلوں
والے کھڑے نظر آئے۔

"کیا پروگرام ہے بھئی؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" ایک درخت کی طرف
سے آواز سنائی دی، لیکن آواز اوپر سے نہیں آئی تھی۔ گویا
وہ جو کوئی بھی تھا، درخت کے پیچھے تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ آواز امیر کالا کی ہے۔"
فرزانہ بولی۔

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔" وہ بولے۔

"یہ سب لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ جب میں

نے انھیں یہ بتایا کہ تم لوگ میرے پنجرے میں پھنس گئے
ہو اور میں تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگا ہوں
تو انھوں نے مجھ سے ایک درخواست کی۔" یہاں تک کہہ
کر وہ رک گیا۔

"اور وہ درخواست کیا تھی؟" انسپکٹر جمشید پُرسکون آواز
میں بولے۔

"یہ کہ اس طرح تو مزا نہیں آئے گا۔ اتنے بڑے دشمن
چپ چپاتے مر جائیں گے اور ان کے دلوں کی بھڑاس دلوں
میں ہی رہ جائے گی۔ لہٰذا یہ پروگرام آن کی آن میں ترتیب
دیا گیا۔ اب یہ لوگ اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے
ہیں۔ ہم اگر چاہتے تو آپ لوگوں سے آپ کے پستول بھی
لے سکتے تھے، لیکن ہم نے سوچا۔ آپ کے دلوں کی
بھڑاس کہیں آپ کے دلوں میں نہ رہ جائے۔ لہٰذا آپ
بھی اپنے اپنے ہاتھ پیر خوب ہلا لیں۔ پہلے ہم آپ لوگوں
کو ہی حملہ کرنے کا موقع دیں گے۔ اس ساری لڑائی کی
وڈیو فلم بھی تیار ہو گی۔ تاکہ ریکارڈ رہے اور ضرورت کے
وقت دیکھ کر خوشی کے لمحات میں اضافہ کیا جا سکے۔"

"پروگرام واقعی زوردار ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو پھر فائرنگ شروع کریں۔"

"یہ ہماری مرضی ہے۔ کہ ہم کس طرح لڑنا پسند کرتے ہیں۔ آپ پابندی عاید نہیں کر سکتے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"ضرور کیوں نہیں۔ اگر آپ حملہ نہیں کریں گے تو آپ کے اِرد گرد کھڑے ہوئے تیس کے قریب آدمی آپ پر حملہ آور ہوں گے اور اپنے اپنے انداز میں حملہ کریں گے۔ یہ اپنے اپنے انداز کے ماہر ہیں۔" امیر کالا کی آواز سنائی دی۔

"تو ٹھیک ہے، یہ اپنے اپنے انداز کو آزما لیں، اجازت ہے۔" انھوں نے کہا۔

"شروع کرو بھئی۔ آج کی یہ جنگ بہت یادگار قسم کی ہونی چاہیے۔ یہ فلم پوری دُنیا میں گھومے گی، یہ بھی خیال رہے۔"

"یاہا۔" ان سب نے یک زبان نعرہ لگایا۔

اور ایک سمت سے ان پر تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ وہ اس سے پہلے ہی ایک دائرے کی صورت میں کھڑے ہو چکے تھے اور ان کے منہ دشمنوں کی طرف تھے۔ ان کا دائرہ گھوم بھی رہا تھا۔ جونہی تیروں کی بارش ہوئی، وہ دائرے کی صورت میں ہی زمین پر

آ رہے۔ تیر ان کے اوپر سے نکل گئے۔ لیکن دشمنوں نے بھی انھیں اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ تیر مسلسل ان کے اوپر سے گزرتے رہے۔ یا آگے پیچھے زمین میں پیوست ہوتے رہے۔ بہت سے تیر تو ان کے بالکل نزدیک گرے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید نے ایک تیر اٹھایا اور اسے کمان کی طرح موڑ کر دونوں سروں پر رسی باندھ دی، رسی انھوں نے پہلے ہی جیب سے نکال لی تھی۔ اب ان کے ہاتھ میں کمان تیار تھی۔ نزدیک آ کر گرنے والے تیروں ہی سے انھوں نے ایک تیر اٹھایا اور اپنی بنائی ہوئی کمان میں رکھ کر ایک دشمن پر چھوڑ دیا۔ یہ ان کے نشانے کی مہارت تھی کہ تیر ٹھیک اس کی پیشانی پر لگا، وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ اچھل کر گرا اور تڑپنے لگا۔ دشمن کی صفوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے۔ آپ ان کے مقابلے میں اپنی گولیاں کام میں لانا نہیں چاہتے۔"

"ہاں! اس لیے کہ ان کی بعد میں ضرورت پیش آ سکتی ہے۔"

"تب پھر ہم بھی کمانیں بنا لیتے ہیں۔"

"تو روکا کس نے ہے۔" وہ مسکرائے۔

انھوں نے بھی ایک ایک کمان تیار کر لی۔ اب دونوں طرف سے تیر اندازی شروع ہو گئی۔ وہ زمین سے چپکے ہوئے تیر چلا رہے تھے۔ جب کہ دشمن سامنے کھڑا تھا اور ان میں سے کسی ایک نے بھی پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسے میں فرزانہ کی آواز ابھری:

"ابا جان! ہمارے خلاف چال چلی جا رہی ہے۔ یہ لوگ گھیرے کو تنگ کر رہے ہیں۔ تیر اندازوں نے ہمیں پوری طرح اپنی طرف لگا رکھا ہے، جب کہ کئی اطراف سے یہ آہستہ آہستہ آگے آ رہے ہیں۔"

"ہوں! میں سمجھ گیا۔" انھوں نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

"آپ کیا سمجھ گئے؟"

"یہ اس کھیل کو لمبا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں جلد نہیں مارنا چاہتے۔ اسی لیے اب تک تیر ہمارے آس پاس گرتے رہے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں لگا۔ گویا ہم اپنی کاری گری سے نہیں، ان کی کوشش سے بچتے رہے ہیں۔"

"ہاں جمشید۔ میں نے بھی یہی بات محسوس کی ہے، کیونکہ دیکھا جائے تو تیروں کی اس قدر زبردست بارش میں ہم بال بال کس طرح بچ سکتے ہیں؟"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ان کا پروگرام جو بھی ہو۔ ہم اپنا

کام جاری رکھیں گے۔ چاروں طرف تیروں کی بارش کرتے رہو اور ان میں سے جتنے بھی کم ہو سکیں۔ کر ڈالو۔" انھوں نے کہا۔

وہ تاک تاک کر تیر چلانے لگے۔ فضا چیخوں سے گونجنے لگی۔ ایسے میں خان رحمان بولے:

"نہیں جمشید۔ ہم اس طرح لڑتے ہوئے ان سے نہیں جیت سکتے۔ جب تک کہ یہ لوگ درختوں پر موجود ہیں، ہم ان پر فتح نہیں پا سکیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی انکل۔ مقابلہ تو ہم کر رہے ہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"اس میں شک نہیں کہ ہم مقابلہ کر رہے ہیں، لیکن میں نے ایک اور بات نوٹ کی ہے۔ اس وقت تک ہم نے جتنے لوگوں کو تیروں کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ سب کے سب اگرچہ چیخ مار کر گرے ہیں، لیکن جلد ہی میں نے انھیں اٹھتے بھی دیکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ یہ لوگ ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ مر نہیں رہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اب ہم بھی گرنے والوں کو دیکھیں گے۔ کہ وہ اٹھتے ہیں یا نہیں"۔ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

وہ تیر چلاتے رہے۔ اور انھوں نے دیکھ لیا کہ گرنے والے کچھ دیر تک تو بے سُدھ لیٹے رہتے تھے، پھر یک دم اُٹھ کر لڑائی شروع کر دیتے تھے۔ گویا خان رحمان نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔

"آخر اس جنگ کا کیا فائدہ؟" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہمیں جسمانی اور ذہنی طور پر تھکا تھکا کر بالکل بے جان کرنا چاہتے ہیں اور پھر چوہوں کی طرح پکڑ لیں گے۔ ان سب نے بلٹ پروف لباس پہن رکھے ہیں۔ یہ تیر بھلا ان کا کیا بگاڑیں گے۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"کیا آپ کا مطلب ہے۔ ہم ہاتھ روک لیں؟"

"ہاں! کم از کم اس طرح ہم نڈھال ہونے سے تو بچ ہی سکتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک خان رحمان۔ تیر اندازی بند۔" انسپکٹر جمشید نے فیصلہ سُنایا۔

انھوں نے ہاتھ روک لیے۔ دشمنوں کے تیر ان کے اوپر سے اور دائیں بائیں سے گزرتے رہے۔ جب انھیں ہاتھ روکے کافی دیر ہو گئی تو امیر کالا کی آواز ابھری:

"کیا ہوا بھئی۔ تھک گئے۔"

"ہاں تھک گئے۔"

"اگر تھک گئے ہیں تو پھر خود کو ہمارے حوالے کر دیں، تمام تر ہتھیار نیچے گرا دیں اور آگے بڑھنا شروع کر دیں۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا:

"کیا مشورہ ہے جمشید؟" خان رحمان بولے۔

"یہی کرتے ہیں۔ اس وقت ایسا کرنے میں فائدہ ہے، ورنہ زد پر تو ہم سب پوری طرح ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ ہتھیار پھینک دو اور آگے بڑھنا شروع کر دو۔" انھوں نے کہا۔

وہ آگے بڑھنے لگے۔ دشمنوں کا گھیرا ان کے گرد تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا۔ اور پھر ان کے چاروں طرف ایک دائرے میں دشمن تلواریں، خنجر اور بھالے لیے کھڑے نظر آئے:

"اب تم لوگ پوری طرح ہمارے قبضے میں ہو۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے اور ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں تم کیا کہتے ہو؟"

"ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہم تو مسٹر امیر کالا سے صرف پوچھنے آئے تھے کہ مردہ خانے سے تمھاری زنجیر کیوں ملی ہے۔ ہمیں افسوس ہے، اس سوال کا جواب بہت زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی سوال کا جواب دینے کے لیے تم لوگوں کو یہاں تک لایا گیا ہے۔" امیر کالا کی آواز سنائی دی اور پھر وہ انھیں نظر بھی آنے لگا۔ وہ ایک گھنے اور تن آور درخت کے پیچھے سے نکلا تھا۔

"شکریہ! ہم سن رہے ہیں۔"

"اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مُردہ میں نے ہی مردہ خانے سے چرایا تھا۔ اس کام کے لیے مجھے خود جانا پڑا۔ خود کیوں جانا پڑا.. اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ ہاں تو وہاں میری زنجیر گر گئی ہو گی۔ مجھے پتا نہیں چلا۔ اور تم اس کے ذریعے میرے ہوٹل پہنچ گئے، لیکن تم کیا جانو۔ وہ ہوٹل کم اور چوہے دان زیادہ ہے۔ اب دیکھ لو۔ تم بالکل چوہے دان کی طرح پھنسے ہوئے ہو۔"

"ہوں! چلو مان لیتے ہیں۔ یہ چوہے دان ہے۔ سوال یہ ہے کہ مُردے کو چرانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ تھا کون؟"

"یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ باتیں تو راز میں بھی رہنی چاہییں۔" وہ ہنسا۔

"میں سمجھ گیا، تم کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں ہو،

چھا چلو اتنا بتا دو۔ سوٹ کا کیا چکر ہے؟"

"اصل خرابی تو وہیں سے شروع ہوئی ہے۔ نہ سوٹ کا چکر لتا۔ نہ تم لوگوں کو یہ دن دیکھنا پڑتا۔"

"خیر۔ اب تو دیکھ لیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔" فاروق نے ہ بنایا۔

"لے چلو بھئی انھیں۔ موت کے غار میں۔ ہم ان لوگوں اپنے ہاتھوں ہلاک کرنا پسند نہیں کریں گے۔ اب یہ جانیں، ت کا غار جانے۔" امیر کالا بولا۔

"موت کا غار جانے۔ کیا وہ زندہ سلامت چیز ہے؟"

"نہیں! جبکہ اس میں تو زندہ لوگ جا کر موت کا جام لیتے ہیں۔ ہم نے کتنے ہی لوگوں کو اس غار میں دھکیلا ر پھر کبھی ان کی صورت نہیں دیکھی۔"

"اس غار میں ہے کیا؟"

"کچھ ہو یا نہ ہو۔ تاریکی ضرور ہوتی ہے۔ اور باہر نکلنے کا کوئی راستا نہیں ہوتا۔ کیا یہ کم ہے؟"

"نہیں! مرنے کے لیے بہت کافی ہے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"اس سے تو بہتر تھا۔ ہم لڑتے ہوئے جان دیتے۔" خان رحمان نے جھلا کر کہا۔

"یہ تو اب بھی کیا جا سکتا ہے۔" اکرام نے فوراً کہا۔

"نہیں بھئی۔ کیا حرج ہے۔ ذرا موت کے غار سے بھی دو دو ہاتھ کر لیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں۔"

وہ چلتے رہے، یہاں تک کہ گھنے درختوں کے درمیان پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر ایک غار کا منہ انھیں نظر آنے لگا:

"یہی ہے وہ غار۔ دیکھ لو۔ باہر سے بالکل صاف ستھرا اور بے خطر نظر آ رہا ہے۔ اور مزے کی بات بتاؤں۔" امیر کالا نے کہا۔

"اگر سخاوت پر اتر ہی آئے ہیں تو بتا دیں۔" فاروق نے کہا۔

"ہم غار کا منہ بند نہیں کریں گے۔ تم لوگوں کو اندر دھکیلنے کے بعد یہاں رکیں گے بھی نہیں۔ اس کے باوجود تم اس سے نہیں نکل سکو گے۔ یہ ہوئی نا بات۔"

"واقعی حیرت انگیز بات ہے۔ خیر یہ تجربہ بھی سہی۔"

دو سو کے قریب آدمی انھیں دھکیلتے ہوئے غار کے منہ تک لے آئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود آ گئے تھے، اگر آنا نہ چاہتے تو یہ دو سو آدمی بھی انھیں غار تک نہیں

لا سکتے تھے۔

غار کے منہ پر پہنچ کر انھیں آگے گھپ تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ہاں منہ کے پاس ہی ڈھلوان زمین نظر آئی تھی، لیکن تھوڑی دور آگے زمین بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ غار کا منہ کچھ اس رخ سے بنا ہوا تھا کہ سورج کی روشنی تو اندر جا ہی نہیں سکتی تھی اور دن کا اجالا بھی ٹامک ٹوئیاں مارتا نظر آ رہا تھا۔

اچانک انھیں پیچھے سے زبردست دھکے دے دیے گئے۔ وہ غار کے اندر ڈھلوان زمین پر گرے اور پھر لڑھکنے لگے۔ ان کے منہ سے مارے خوف کے چیخیں نکل گئیں۔ انھوں نے فوراً اپنے سروں کو دونوں بازوؤں کے درمیان لے لیا۔ ورنہ سر بری طرح زخمی ہو سکتے تھے۔

وہ تیزی سے نیچے ہی نیچے لڑھکتے گئے۔ اور پھر ان کے جسم کسی چیز سے ٹکرا کر رک گئے۔ گھور تاریکی میں وہ ایک دوسرے کو بالکل بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ انھوں نے ہاتھ ادھر ادھر پھیلائے۔ اور ایک دوسرے کو تھام لیا۔

"سب لوگ ٹھیک تو ہیں۔" انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری۔

"میں تو صرف اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ چوٹیں

ضرور آئی ہیں، لیکن کوئی خطرناک چوٹ نہیں ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہاں! میں بھی یہی کہتا ہوں۔"

سب نے اپنا اپنا حال بتایا۔ غار کی تہ میں ایک عجیب سا شور مسلسل گونج رہا تھا۔

"ہم اس وقت پتھریلی سطح پر ہیں۔ ہاتھوں سے ٹٹولنے پر میں یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ یہ غار کا آخری سرا ہے اور چونکہ ہم مسلسل گرتے رہے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک ترچھا کنواں کہلا سکتا ہے۔ اس ترچھے کنوئیں پر اگر ہم اوپر کی طرف چڑھنے کی کوشش شروع کریں تو شاید ہی اوپر تک پہنچ سکیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ تھوڑا سا اوپر چڑھیں گے، پھر گر جائیں گے۔ پھر چڑھیں گے، پھر گر جائیں گے۔ غرض اس طرح ہم بھوک اور پیاس کی حالت میں موت کو گلے لگا لیں گے۔ یہاں ہڈیوں کے کچھ پنجر بھی میرے ہاتھوں سے ٹکرائے ہیں، گویا یہ لوگ واقعی اپنے دشمنوں کو یا غداروں کو اس غار میں دھکیلتے رہے ہیں۔ اب رہ گیا یہ شور۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ غار کے نیچے یا دوسری طرف کوئی دریا ہے۔ اور اس پتھریلی زمین میں کوئی سوراخ ہے۔ اس سوراخ میں سے شور

ہم تک پہنچ رہا ہے۔"

"سوال یہ ہے جمشید کہ سوراخ کتنا بڑا ہے۔ اگر ہم اس میں سے گزر سکیں تو پھر ہم دریا میں ہوں گے اور ہمارے بچنے کے امکانات ہیں۔"

"خان رحمان۔ جس گھنے جنگل میں ہمیں گھیرا گیا، بھلا اس کے دوسرے سرے پر دریا لگتا ہے۔"

"ہاں جمشید۔ دریائے سون۔"

"تب یہ آواز اسی کی ہے۔ میں اس سوراخ کو تلاش کرتا ہوں۔ اس غار میں پھینکے جانے والے شاید سوراخ کو تلاش نہیں کر سکے۔ یا بعض نے کیا ہوگا تو اس میں اتر نہیں سکے، لیکن خان رحمان، ہم ایسا کریں گے۔"

"ان شاء اللہ"! ان کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر جمشید کے ساتھ انھوں نے بھی پتھریلی زمین کو ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ ایسے میں محمود کا سر زور سے فاروق کے سر سے ٹکرا گیا:

"دیکھ کے ذرا۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"عجیب احمق ہو۔ اس قدر گھپ اندھیرے میں دیکھوں کس طرح۔"

"اچھا بھائی معاف کر دو۔ اس اندھیرے نے تو عقل

بھی سلب کر لی ہے۔"

"تم تو اس طرح کہ رہے ہو جیسے اس سے پہلے تمھاری عقل بڑے تیر مارتی رہی ہو۔" فرزانہ کی آواز سنائی دی۔

"اوہ ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا۔ ترکیبوں کا ٹھیکا تو ہمیشہ سے تمھارے پاس چلا آ رہا ہے۔" فاروق فوراً بولا۔

"سوراخ مل گیا۔ مبارک ہو۔ لیکن یہ کافی اونچائی پر ہے۔ اور اس تک پہنچنا بھی آسان کام نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اس میں سے صرف ایک آدمی مشکل سے گزر سکتا ہے۔ ہاں! یہ بات میں یقین سے کہ سکتا ہوں کہ یہ سوراخ دریا کے اوپر ہے۔"

"تب پھر پہلے ہمیں اپنے پاس پہنچ جانے دیں۔ ابھی چھلانگ نہ لگائیں۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میری آواز کی سیدھ میں چلے آؤ۔"

آخر وہ سب ان کے آس پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے ٹٹول کر سوراخ کو بھی دیکھ لیا۔ ایسے میں خان رحمان کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی:

"شش۔ شاید۔ جمشید۔ میں اس میں نہ اُتر سکوں۔ میں قدرے سڈول ہوں۔"

"تب پھر خان رحمان۔ سب سے پہلے تم کوشش کرو۔

تم نہیں اُتر سکو گے تو پھر ہم سب بھی تمھارے ساتھ
ی رہیں گے۔"

"یہ کیا بے وقوفی کی بات کہی۔" خان رحمان نے بھرائی
ئی آواز میں کہا۔

"میں تمھارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا خان رحمان۔"

"لیکن ایسا کرنا خودکشی کے برابر ہو گا اور پھر تمھیں تو
باہر کی دُنیا میں جا کر امیر کالا کو گرفتار کرنا ہے۔
ٹ والے چکر سے پردہ اٹھانا ہے۔ اور بھی ملک کے
ے نہ جانے کیا کچھ کرنا ہے۔ میرا کیا ہے، میں تو ایک
ے کار آدمی ٹھہرا۔"

"نہیں خان رحمان۔ تم بھی اس ملک اور قوم کے لیے
اہم نہیں ہو۔ نہیں ہو، تب بھی یہ دوستی کے خلاف
ت ہے۔ ہم جائیں گے تو ساتھ ورنہ سب کے سب نہیں
ئیں گے۔"

"تمھارا یہ فیصلہ بالکل غلط ہے جمشید۔"

"کوئی بات نہیں۔ ان حالات میں میں درست فیصلہ کر
ی کس طرح سکتا ہوں۔"

"میں کہتا ہوں جمشید۔ ضد نہ کرو۔"

"اور میں کہتا ہوں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اس

میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی - تم اس سوراخ میں اُترنے
کی کوشش تو کرو۔"

"ٹھیک ہے - اب میں یہ کوشش ضرور کروں گا -
میں تم سب کی زندگیوں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا"
یہ کہہ کر خان رحمان نے ہاتھ سوراخ کے کنارے پر جما
دیلے اور اس میں اُتر گئے، لیکن ان کا جسم اس میں
اس طرح پھنس گیا جیسے گول سیلنڈر ان کے گرد منڈھ
دیا گیا ہو -

"مم - میں - میں اس میں پھنس گیا ہوں جمشید۔"

"حرکت جاری رکھو خان رحمان - جلد ہی تمھارا جسم پسینے
میں بھیگ جائے گا اور اس کی پھسلن تمھیں شاید نیچے سرکا
دے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھا - میں بدستور نیچے سرکنے کی کوشش کرتا رہوں گا،
اب جو اللہ کو منظور۔"

"موت کا ایک وقت مقرر ہے خان رحمان - اگر ہماری
موت یہیں لکھی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں ٹھیک تو ہے۔" خان رحمان بولے۔
انھوں نے کوشش شروع کر دی - کچھ دیر بعد ان

کی آواز اُبھری:

"مم - میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا ہے جمشید -
تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مجھے نیچے کی طرف دھکیل دو۔"

"اس طرح تمھارا جسم چھل جائے گا۔"

"یہ سب کی زندگی بچنے سے تو بہتر رہے گا۔"

"لیکن میں ایسا کس طرح کروں؟" انسپکٹر جمشید بے چارگی
کے عالم میں بولے۔

"تمھیں اپنا اور باقی سب کا تو خیال کرنا چاہیے۔"

"اچھا میں ایسا بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔"
یہ کہہ کر انھوں نے سوراخ میں ہاتھ داخل کیا - خان
رحمان کافی نیچے تھے، انھیں پورا جھکنا پڑا - پھر بھی ان کے
ہاتھ خان رحمان کے سر سے نہ ٹکرائے:

"تم کافی نیچے ہو خان رحمان - اب مجھے سوراخ میں اُتر
کر پیروں سے دباؤ ڈالنا پڑے گا - کیا خیال ہے؟"

"بہت ہی خوب صورت۔" خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

"اس قدر اندھیرے میں اور خوب صورت - کمال ہے۔"
فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔
انسپکٹر جمشید سوراخ میں لٹک گئے - ان کے پیر خان رحمان
کے کندھوں پر جا ٹکے - اب جو انھوں نے زور لگایا تو

خان رحمان نیچے سرک گئے۔

"مم۔ میں نیچے سرک رہا ہوں۔"

"بہت خوب۔ مزا آ گیا۔ تم لوگ بھی میرے پیچھے آ جانا بھئی۔ میں تمہارے انکل کو نیچے جانے میں مدد دے رہا ہوں۔"

"بہت بہتر!"

"تو پھر کیوں نہ ہم بھی اترنا شروع کر دیں۔"

"ٹھیک ہے، آ جاؤ۔"

وُہ نیچے سرکتے چلے گئے۔ اُترتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس سلنڈر نما سوراخ میں وُہ سبھی داخل ہو گئے۔ اور انچ انچ کر کے نیچے سرکنے لگے۔ یہ ان کی زندگیوں کا انوکھا ترین اور تکلیف دہ سفر تھا۔ جلد ہی انھیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وُہ اس سلنڈر میں نہ جانے کتنے سالوں سے اُتر رہے ہوں اور یہ سلنڈر کبھی ختم نہ ہو گا، لیکن وہ بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ نیچے سرکتے ہی رہے۔ کئی بار انھیں دم گھٹتا بھی محسوس ہوا۔ شاید ان سب کے سلنڈر میں پھنس جانے کی وجہ سے ہوا کی آمد و رفت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔

"اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہم نیچے کی طرف پورا

زور لگا دیں۔ اس طرح ہمارے گرنے کی رفتار بڑھ سکتی ہے۔"

فرزانہ نے کہا۔

"ہاں! یہ ترکیب کامیاب ہو جائے شاید۔"

انھوں نے مل کر نیچے کی طرف زور لگایا۔ اچانک انھیں یُوں لگا جیسے وہ زور سے پھسلے ہوں۔

حوالات میں

فوراً ہی انھیں احساس ہو گیا کہ وہ ایک ترچھے کنوئیں میں لڑھکتے چلے جا رہے ہیں، نیچے ہی نیچے۔ اور پھر وہ چھپاک سے پانی میں جا گرے۔ انھوں نے فوراً تیرنا شروع کر دیا۔ ایسے میں انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ دریا میں ایک چٹان سی اُبھری ہوئی تھی۔ یہ ضرور اسی سرنگ کا دوسرا سرا تھی۔ اس میں جا بجا دراڑیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

"اللہ کی کیسی شان ہے۔ اگر چٹان میں یہ دراڑیں نہ ہوتیں تو ہم سُرنگ میں زندہ نہیں رہ سکتے تھے، ہوا ان میں سے اندر جا رہی تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہرحال یہ ہماری زندگی کا انوکھا ترین سفر تھا۔" خان رحمان نے کہا۔

جلد ہی انھیں دریا کا کنارہ نظر آنے لگا۔ دریا اس جگہ بہت زیادہ چوڑائی لیے ہوئے تھا۔ اب انھوں نے

چٹان کی طرف دیکھا تو وہ کوئی ابھرا ہوا سا مینار نظر آئی۔ کنارے پر لیٹ کر انھیں کافی دیر تک سانس لینا پڑا۔ اس طرح ان کے کپڑے بھی کسی حد تک خشک ہو گئے، لیکن ان کے حلیے عجیب ہو رہے تھے، کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ ہاتھوں، پاؤں اور چہروں پر خراشیں ہی خراشیں نظر آ رہی تھیں، اکثر خراشوں سے خُون رس رہا تھا، اس حالت میں انھوں نے شہر کا رُخ کیا۔

"لوگ ہمیں جن بھوت نہ سمجھ بیٹھیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کوئی بات نہیں ہمارا کیا جاتا ہے۔" محمود نے فوراً ہاتھ نچا کر کہا۔

"بہتر ہو گا کہ ہم اپنے حلیے درست کر کے شہر جائیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"جی ہاں۔ ہمارے لیے لباس تو آسمان سے ٹپک پڑیں گے اور غسل کے لیے بارش شروع ہو جائے گی۔ رہ گیا صابن کا مسئلہ تو وہ بھی اللہ تعالیٰ پانی میں صابن کا اثر پیدا کر دیں گے۔" فاروق نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"اللہ تمھاری زبان مبارک کرے۔" محمود بولا۔

"آمین!" فرزانہ نے دُعا کے انداز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید مسکرانے لگے۔ خان رحمان اور اکرام نے بھی

ان کا ساتھ دیا۔ ایسے میں وہ ایک گاؤں تک پہنچ گئے۔
گاؤں کے پہلے گھر کے دروازے پر رک کر انھوں نے دستک
دی۔ ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے
انھیں دیکھنے لگا۔

"آپ۔ آپ۔ کک۔ کون لوگ ہیں؟"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کم از کم ہم جن بھوت نہیں
ہیں۔ ہاں، مصیبت کے مارے انسان ضرور ہیں۔ کیا ہمیں
تھوڑی دیر کے لیے آرام کی جگہ مل سکے گی؟"

"آجائیں اندر۔" اس نے راستہ دیا۔

وہ اندر آگئے۔ ایک کچے کمرے میں انھیں بٹھایا گیا:

"اس گاؤں کے کس گھر میں فون ہے؟"

"صرف زمیندار صاحب کے گھر میں ہے۔"

"بھئی واہ۔ پھر تو بن گیا کام۔" انسپکٹر جمشید نے خوش
ہو کر کہا۔

"جی کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ مجھے زمیندار صاحب کے گھر تک لے چلیں، میں
وہاں سے شہر ایک فون کروں گا، پھر ہمارے لیے ضرورت
کی چیزیں آجائیں گی۔"

"آئیں میرے ساتھ۔ لیکن زمیندار صاحب بہت کنجوس

آدمی ہیں، فون شاید ہی کرنے دیں۔" اس نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔"

باقی لوگوں کو وہیں چھوڑ کر انسپکٹر جمشید زمیندار کے گھر
پہنچے۔ اس نے بہت روکھے انداز میں مصافحہ کیا:

"کیا بات ہے جناب؟"

"ہم لوگ ایک مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں، اگر شہر ایک
فون کر دیں تو ہمارا کام بن جائے گا۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن جناب، میرا فون تو بہت
دنوں سے خراب پڑا ہے۔ اور محکمے کے لوگوں نے اس کی
خبر تک نہیں لی۔"

"لائیے! میں فون ٹھیک کر دوں گا، میں یہ کام
جانتا ہوں۔"

"ارے کیا واقعی۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"جی بالکل۔" وہ مسکرائے۔

اور اسے انھیں فون تک لانا پڑا۔ انھوں نے ریسیور
اٹھا کر دیکھا اور سمجھ گئے کہ کیا چالاکی کی گئی ہے۔ انھوں
نے فوراً خرابی کو دور کیا اور نمبر ملانے لگے۔ دفتر سے بات
کر کے انھوں نے ریسیور رکھ دیا اور زمیندار کی طرف مڑے:

"پورے گاؤں میں صرف ایک ٹیلی فون ہے۔ آپ

کو چاہیے کہ ضرورت مند کو فون کرنے دیا کریں۔ آپ کال
کے پیسے لے لیا کریں۔ اس سے یہ چالاکی نہ کریں کہ
فون خراب پڑا ہے۔"

"وہ۔ وہ۔ آپ کو نہیں معلوم۔ ہر کوئی آ جاتا ہے
فون کرنے۔"

"جب آپ کال کے پیسے لینے لگ جائیں گے تو پھر ہر
کوئی نہیں آئے گا، صرف وہی آئے گا جسے ضرورت ہو گی،
اگر آپ نے آئندہ ایسا نہ کیا تو میں آپ کے ساتھ بُری طرح
بھی پیش آ سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب! آپ مجھ سے بُری طرح کیوں کر پیش آ
سکتے ہیں۔" اس نے تنک کر کہا۔

"یہ آپ کو اس وقت معلوم ہوگا جب آپ لوگوں کو
فون نہیں کرنے دیں گے۔" یہ کہہ کر انھوں نے چند کرنسی نوٹ
میز پر رکھے اور باہر نکل آئے۔ زمیندار سکتے کے عالم
میں کھڑا رہ گیا۔

دو گھنٹے بعد دفتر سے مدد آ گئی۔ انھوں نے اپنے
حلیے درست کیے، لباس تبدیل کیا اور شہر کی طرف روانہ
ہو گئے۔

"سرخاب ہوٹل اور اس جنگل کا کیا کیا گیا ہے؟"

"پوری طرح گھیرے میں لیے جا چکے ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ کسی کو ہمارے بارے میں بتایا
نہیں گیا؟"

"جی۔ بالکل نہیں۔"

"امیر کالے کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"اطلاع یہی ہے کہ وہ ہوٹل میں موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ امیر کالے کے ساتھ پورے جنگل کے بدمعاشوں
ب گرفتار کیا جائے گا ان شاء اللہ۔" انھوں نے کہا۔

وہ سیدھے گھر آئے۔ بیگم جمشید ان کے انتظار میں سوکھ
کانٹا ہونے سے بال بال بچ گئیں۔

"اب میں آپ کو کھانا کھائے بغیر ہرگز نہیں جانے
ں گی۔"

"لیکن تمھیں یہ کیسے پتا چل گیا کہ ہم پھر جانے کا ارادہ
تے ہیں؟"

"آپ کے چہروں سے۔" اس نے منہ بنایا۔

"ٹھیک ہے۔ تم کھانا لگاؤ۔ ہم کھا کر ہی جائیں گے۔"
انھوں نے جلدی جلدی میک اپ کیا، اپنے چہرے
ل طور پر تبدیل کیے اور کھانا کھا کر گھر سے نکل آئے۔
ام کو سارا پروگرام پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ اکرام نے

بھی اپنا حلیہ تبدیل کیا تھا – لہٰذا وہ ہوٹل سرخاب کے
سامنے پہنچ گئے – اندر پیغام بھجوا دیا گیا کہ پولیس ہوٹل کی
تلاشی لینا چاہتی ہے – پولیس کو شک ہے کہ اندر انسپکٹر
جمشید اور ان کے ساتھیوں کو قید میں رکھا گیا ہے –

یہ پیغام ملتے ہی امیر کالا فوراً باہر نکل آیا، اس نے
ان سے ہاتھ ملایا اور بولا :

" یہ بالکل غلط ہے – ہوٹل میں انسپکٹر جمشید اور ان کے
ساتھی کہیں بھی قید نہیں ہیں۔"

" تلاشی تو ہم لیں گے۔"

ضرور جناب – کیوں نہیں۔"

ہوٹل کی تلاشی شروع کی گئی – امیر کالا کو ساتھ ساتھ رکھا
گیا، اکرام اس کے پیچھے سائے کی طرح تھا – یہاں تک کہ
وہ اس کمرے میں پہنچ گئے جس میں تہ خانے کا راستا تھا –
تلاشی کرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے وہ تہ خانے کے دروازے
تک آ گئے :

" یہ کیا ہے ؟"

" بیکار چیزیں سٹور کرنے کے لیے۔" اس نے کہا۔

" ہوں ! چلیے – اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

محمود ، فاروق اور فرزانہ نے اپنے قد بڑھانے کی

ترکیبیں کی ہوئی تھیں ، ورنہ میک اپ کے باوجود وہ ان کی
تعداد سے ہوشیار ہو سکتا تھا –

اب وہ اس کے ساتھ اس تہ خانے میں اُترے –
تہ خانہ خالی پڑا تھا :

" یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

" حال میں ہی بے کار چیزیں فروخت کی ہیں۔"

" اوہ اچھا۔"

وہ اِدھر اُدھر لائٹیں مارنے لگے –

" ارے ! یہ کیا ہے اس طرف۔" خان رحمان اس چوکور
خانے میں اترتے ہوئے بولے ، اب اس میں پتھر نہیں
تھے – سب اس طرف متوجہ ہو گئے – ایسے میں امیر کالا
نے زینے کی طرف دوڑ لگا دی ، لیکن اکرام نے فوراً اپنی ٹانگ
اڑا دی :

" ایسی بھی کیا جلدی ہے بھئی۔" اکرام نے مسکرا کر کہا، ساتھ
ہی اس نے پستول اس کی کن پٹی سے لگا دیا –

" کیوں مسٹر ، یہ کیا ہے ؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا –

" یہ فرار کا راستا ہے – اور اسی راستے سے تم نے فرار
ہونے کی کوشش کی تھی – انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں نے

تمھارا تعاقب کیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ کہاں گئے۔ یہ تم بتاؤ گے۔"

"مم۔ میں نہیں جانتا۔ یہ راستا جنگل کی طرف نکل جاتا ہے ــــ میں اس جنگل میں چھپ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کہاں گئے۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"گویا تم یہ بات مانتے ہو کہ وہ یہاں آئے تھے۔"

"ہاں!" اس نے کہا۔

"اچھا، اب اس راستے سے ہم جنگل میں چلیں گے۔ آؤ۔"

وہ اس راستے سے جنگل میں آ گئے۔

"ہاہاہا" امیر کالے نے قہقہہ لگایا۔

"کیا بات ہے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔" انسپکٹر جمشید نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں! میں خوشی سے پاگل ہو گیا ہوں۔ جس جگہ میں نے انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں کو پہنچایا ہے، اسی جگہ تمھیں بھی پہنچا رہا ہوں۔ خوش ہو جاؤ۔"

"اور تم نے انھیں کہاں پہنچایا تھا؟"

"موت کے غار میں۔ جس سے آج تک کوئی بچ کر نہیں نکلا۔" اس نے کہا۔

"اوہو اچھا۔ کہاں ہے وہ غار؟"

"ابھی تمھیں میرے ساتھی وہیں لے جائیں گے۔"

"تمھارے ساتھی، لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"ان درختوں پر مسلح آدمی موجود ہیں اور تم سب ان کی زد پر ہو۔ شاخوں کی حرکت تمھیں میری بات کا یقین دلا دے گی۔"

اس آواز کے ساتھ ہی شاخیں ہلیں:

"دیکھا!"

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ ہم بھی پھنس گئے۔ جس طرح انسپکٹر جمشید پھنسے تھے۔" انھوں نے کہا۔

"ہاں! بالکل۔"

"تو تم نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ موت کے غار میں دھکیل کر۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"تم بے وقوف ہو۔" انسپکٹر جمشید پُرسکون آواز میں بولے۔

"میرے بارے میں تم نے کہا کہ میں بے وقوف ہوں۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"ہاں! یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا میک اپ اتار دیا۔ اس مرتبہ بولے بھی اصل آواز میں تھے۔

"یہ۔ یہ۔ یہ کیا۔ آ۔ آپ۔ آ۔ آپ زندہ ہیں۔"

"ہاں! میں ہی نہیں، میرے سب ساتھی بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے زندہ ہیں۔"

"نہیں!" وہ چلایا۔

"تم لوگ بھی میک اَپ اتار کر اسے یقین دلا دو کہ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔"

انھوں نے بھی میک اَپ اتار دیا۔ اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں، پھر وہ جھک کر بولا:

"لیکن اس بار تم نہیں بچو گے۔ موت کا غار دھوکا دے گیا۔ میں اب تم لوگوں کو اپنے سامنے ذبح کراؤں گا۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"لیکن کس سے کراؤ گے؟"

"آجاؤ ساتھیو۔ نیچے۔ کچھ اوپر بھی رہیں، جو انھیں زد پر لیے رہیں گے۔"

درختوں پر سے دھم دھم لوگ اُترنے لگے۔ انھیں دیکھ دیکھ کر امیر کالا کی حالت خراب ہوتی چلی گئی، کیونکہ وہ سب کے سب سادہ لباس والے تھے۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

"بے وقوف! ان جرائم پیشہ لوگوں کو تو ہم نے پہلے ہی قابو میں کر لیا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اور پھر اسے جکڑ لیا گیا۔

"مسٹر امیر کالا۔ اب تمھارے لیے موت کے غار کی سزا ...کرتا ہوں۔"

"ن۔ نہیں۔ نہیں۔ آپ مجھے گولی مار دیں۔ لیکن اس ...یں نہ دھکیلیں۔"

"کیوں مسٹر امیر کالا۔ تم نے بھی تو ہمارے لیے وہ ...ت تجویز کی تھی۔ اب تم اپنے لیے اسے کیوں پسند نہیں ...رہے۔" خان رحمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں ہر سزا بھگتنے کے لیے ...ر ہوں۔ پھانسی پر لٹکا دیں۔ بجلی کی کرسی پر بٹھا دیں، ...لی سے اڑا دیں۔"

"نہیں بھئی۔ اسے موت کے غار تک لے چلو۔" انسپکٹر ...ید بولے۔

وہ یک دم ان کے پیروں میں گر گیا اور لگا ہاتھ جوڑنے:

"اسے اٹھالو اور غار تک لے چلو۔"

وہ ساکت ہو گیا اور گھسیٹ کر غار کے دہانے تک لایا گیا، ...اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا:

"تت۔ تو کیا آپ واقعی مجھے غار میں دھکیل دیں گے؟"

"اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ تم میرے

سوال کا جواب دیتے ہو یا نہیں"۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے اس مردے کو کیوں چرایا تھا۔ مردہ کس کا تھا؟"

"ہاں! میں سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے فوراً کہا۔

"بہت خوب، بتاؤ۔"

"یہاں نہیں۔ مجھے اپنے دفتر لے چلیں۔ ساری بات وہیں بتاؤں گا۔"

"نہیں بھئی۔ یہیں بتاؤ۔"

"مجھے ایسا کرنے کے لیے مون لائٹ ٹیکسٹائل ملز کے مالک نے کہا تھا۔ لاش ہمارے اس ساتھی کی تھی۔ جس نے خان رحمان سے پستول کے زور پر سوٹ حاصل کیا تھا۔ اس نے سوٹ لا کر مجھے دیا اور میں نے مون لائٹ کے مالک کو دے دیا، لیکن اس نے نیا حکم یہ دیا کہ جس آدمی نے سوٹ خان رحمان سے حاصل کیا تھا، اسے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ تاکہ معاملے کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔ میں نے ایک گاڑی کے ذریعے اسے کچلوا دیا۔ اس پر بھی مون لائٹ کے مالک کا اطمینان نہ ہوا، اس نے حکم دیا کہ مردہ خانے سے اس کی لاش بھی اٹھوا لاؤں۔ میں نے لاش بھی اس

تک پہنچا دی اور اپنا معاوضہ اس سے وصول کر لیا۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ جس کے لیے کام کرتے ہیں، اس کا نام ہرگز زبان پر نہیں لاتے۔ اس لیے جب آپ لوگ مجھ تک پہنچ گئے تو میں نے جان لیا کہ اب آپ لوگ زبان کھلوا کر رہیں گے۔ لہٰذا آپ لوگوں کو موت کے غار تک لے آیا۔" یہاں تک کہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"یہ باتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ اور اب تم قانون کے مہمان رہو گے۔ لے چلو بھئی اسے۔"

دوسرے دن وہ مون لائٹ ٹیکسٹائل ملز پہنچ گئے۔ معلوم ہوا، مل کے مالک کا نام اکبر کھوٹا تھا۔ اکبر کھوٹا نے ان کا استقبال حیرت زدہ انداز میں کیا۔

"مسٹر اکبر۔ میں آپ کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"اب انجان بننے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہ رہے ہیں۔"

"امیر کالا نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ کہ آپ نے اس سے کس قدر خوفناک کام لیے ہیں۔"

"میں اس وقت تک کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں

سمجھ سکا۔"

"ابھی جب ہم آپ کو امیر کالا کے سامنے لائیں گے اور آپ اس کا بیان سنیں گے تو سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔"

"آخر میں نے کیا کیا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم آپ کی مل کو چیک کرنا چاہتے ہیں۔ مل میں بننے والے کپڑے کو چیک کرنا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بہت خوشی سے ایسا کریں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"کیا آپ وارنٹ کا مطالبہ نہیں کریں گے؟"

"وارنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تلاشی لے لیں۔"

انھوں نے سادہ لباس والوں کو اشارہ کیا۔ وہ تلاشی کا کام مکمل کرنے کے لیے چلے گئے۔

"آپ کپڑے کے تھانوں کے ذریعے کیا جرم کر رہے ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"میں اور کپڑے کے تھانوں کے ذریعے جرم۔ یہ آپ کیا کہ رہے ہیں جناب۔ بھلا کپڑے کے تھانوں کے ذریعے بھی جرم ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! کیوں نہیں۔ کیا آپ کا کپڑا دوسرے ملک

بھی جاتا ہے؟"

"بالکل جاتا ہے۔ کیا یہ کوئی قابلِ اعتراض بات ہے؟" اکبر کھوٹا نے کہا۔

"نہیں! لیکن اگر اس کے ذریعے کوئی غیر قانونی چیز ملک سے باہر بھیجی جا رہی ہو تو یہ حد درجے قابلِ اعتراض بھی ہے۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ آپ جرم ثابت کر دیں۔ میں اپنا جرم مان لوں گا۔"

"ہم ایسا ضرور کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اگر جرم ثابت نہ کر سکے تو آپ کو گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا، لیکن ایک سوال ضرور آپ سے کروں گا۔"

"فرمائیے۔" اس نے کہا۔

"آپ سے آخر امیر کالا کو کیا دشمنی ہے۔ وہ بلا وجہ آپ کا نام کیونکر لگا سکتا تھا؟"

"پہلی بات یہ کہ میں جانتا ہی نہیں، امیر کالا کون ہے، دوسری بات یہ کہ میں نے نہیں، اس نے میرے بارے میں یہ بیان دیا ہے۔"

"پہلے ہم تھانوں کا جائزہ لیں گے۔"

مل کے تھانوں کو چیک کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا،

لیکن وہ بھی بہت سے سادہ لباس والے لے کر آئے تھے۔
آخر چیکنگ مکمل ہو گئی ، لیکن کسی تھان میں کوئی گڑبڑ نظر نہ آئی۔ اس دوران انسپکٹر جمشید اکبر کھوٹا کے بارے میں مل کے ملازمین سے بہت سوالات کر چکے تھے۔ آخر وہ اس کے پاس آئے اور بولے :

" اب میں پہلے ساری بات بتاؤں گا ، پھر امیر کالا کا بیان آپ کو سناؤں گا ، اس کے بعد آپ سے چند ایک سوال کروں گا۔"

" جی فرمائیے۔"

انھوں نے تفصیلات بتا دیں۔ اکبر کھوٹا کے چہرے پر حیرت کا ایک سمندر نظر آیا :

" میرا ان تمام باتوں سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اس ظالم نے بالکل جھوٹ بولا ہے۔"

" تو پھر اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔"

" اور وہ کیا ؟"

" ہم آپ کو امیر کالا کے پاس لے چلتے ہیں۔ آپ دونوں کو آمنے سامنے کرا دیتے ہیں۔ معلوم ہو جائے گا ، جھوٹا کون ہے۔"

" ضرور۔ کیوں نہیں۔ لیکن مجھے ذرا کپڑے تبدیل کرنا ہوں

ل۔ اس وقت میں مل کے لباس میں ہوں۔"

" کوئی حرج نہیں۔ اسی میں چلے چلیے۔"

" جی نہیں ، مل کے مُلازمین کے لیے میری ہدایت یہ ہے کہ وُہ مل کے لباس کو مل کے باہر ہرگز استعمال نہ کریں۔ لٰہذا میں اپنے حکم کی خلاف ورزی کسی طرح بھی نہیں کر سکتا۔" کبر کھوٹا نے کہا۔

" اچھی بات ہے۔ آپ لباس تبدیل کر لیں۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

وہ اپنے دفتر کے پچھلے حصے میں چلا گیا ، دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس کے بعد وہ اسے ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ پولیس والے انھیں دیکھ کر چوکس ہو گئے۔

" ہمیں امیر کالا کی کوٹھڑی تک لے چلیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

" آئیے سر۔"

" امیر کالا سے کوئی شخص ملنے تو نہیں آیا تھا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

" ایک شخص آیا تو تھا سر۔"

" ملنے تو نہیں دیا؟"

"جی۔۔جی ہاں۔ ملنے تو دیا تھا سر۔ کیونکہ ایسی کوئی ہدایت ہمیں نہیں ملی تھی۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔"

وہ حوالات کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ چکرا کر رہ گئے۔

وہی سوٹ

امیر کالا حوالات کے فرش پر بالکل چت لیٹا ہوا تھا، اس کی آنکھیں باہر کو اُبلی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں اور منہ سے خون کی ایک لکیر نکل کر گردن تک آ گئی تھی۔

"یہ تو مر چکا ہے اور غالباً اسے زہر دیا گیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"تب پھر اسے زہر دینے والا وہی تھا جو ملنے آیا تھا، کیونکہ اس کے علاوہ تو کوئی ملنے آیا ہی نہیں۔ کیوں بھئی، اس کا حلیہ کیا تھا؟" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

"اس کا حلیہ۔" کانسٹیبل سوچ میں پڑ گیا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"میں نے توجہ نہیں دی تھی سر۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ ایک لمبے قد کا آدمی تھا۔"

"لمبے قد کے تو اس شہر میں اَن گنت لوگ ہوں گے۔"

انھوں نے منہ بنایا۔

"ایک منٹ سر۔ وہ اجازت لینے کے لیے حوالدار صاحب کے پاس بھی تو گیا تھا۔ شاید انھوں نے اسے دیکھا ہو۔ کیوں سر؟"

"ہاں! وہ لمبے قد کا تھا۔ سانولا رنگ تھا۔ ایک ہاتھ کی بائیں اُنگلی غائب تھی۔"

"اوہ۔ یہ حلیہ تو میرے ذہن کے ریکارڈ میں ہے۔ وہ امیر کالا کا ہی آدمی تھا۔ اور غالباً اسی کے اشارے پر آیا تھا۔ گویا امیر کالا نے خودکشی کر لی۔" اکرام نے جلدی جلدی کہا۔

"اُنگلی کٹا آدمی، ہمیں ملے گا کہاں؟" محمود نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

"میں جانتا ہوں، وہ کہاں رہتا ہے۔ کیا ہم اِسی وقت چلیں؟" اکرام بولا۔

"ہاں بالکل!" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن ابا جان! اس کی گرفتاری سے کیس میں تو کوئی مدد ملے گی نہیں۔ وہ کسی اور کا بھیجا ہوا آتا تو ایک بات بھی تھی۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"لیکن اس کی گرفتاری تو ضروری ہے بھئی۔ خیر۔ اکرام

ے لے آنا۔ ہم گھر چلتے ہیں۔ اس کیس پر اب نئے سرے
ے غور کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

"اوکے سر۔ میں اسے گھر ہی لے آؤں گا۔"

اکرام چلا گیا۔ اب وہ اکبر کھوٹا کی طرف مڑے:

"آپ جا سکتے ہیں، لیکن بغیر اجازت شہر سے باہر جانے کی
ش نہ کیجیے گا۔"

"بہت بہتر۔ ویسے آپ بہت عظیم ہیں۔" اکبر کھوٹا نے کہا۔

"کیا مطلب۔ یہ مجھ میں آپ کو عظمت کیسے نظر آ گئی۔"
پکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"کوئی اور پولیس اِنسپکٹر ہوتا تو مجھے گرفتار کیے بغیر نہ
تا اور پھر میں نہ جانے کتنے دن حوالات میں گزارتا۔ ضمانت
لیے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے۔ کیوں کہ ایک پیشہ ور
رم نے میرا نام لیا تھا۔"

"یہ بات عظمت والی نہیں۔ انصاف والی ہے۔ یوں بھی
ں مجرم کو اس وقت تک گرفتار نہیں کرتا جب تک کہ اس
جرم کا مکمل ثبوت نہ حاصل کر لوں۔ اس کیس میں اگر
پ مجرم ہیں تو یقین کر لیں، آپ کے خلاف بھی مکمل ثبوت
ا حاصل کر لوں گا۔"

"شکریہ جناب! زندگی میں پہلی بار کسی ایسے پولیس آفیسر

کو دیکھ رہا ہوں۔"

"آیندہ آپ اور ایسے لوگوں کو بھی دیکھیں گے، ہم نے بنیاد رکھ دی ہے۔ آپ ان بچوں کو دیکھ رہے ہیں۔ کل جب یہ بڑے ہوں گے تو یہ بھی بالکل مجھ جیسے پولیس آفیسر بنیں گے۔ اور اسی طرح انسپکٹر کامران مرزا کے بچے۔ تیسری طرف شوکی برادرز ہیں۔ وہ بڑے ہوں گے تو انھیں بھی پولیس میں ملازمت مل جائے گی اور وہ بھی بغیر کسی ثبوت کے کسی شخص کو گرفتار نہیں کیا کریں گے، بلا وجہ تشدد نہیں کیا کریں گے۔ یہ لوگ ضرور ہمارے ملک میں اندھیر نگری کو ختم کرنے والے بنیں گے۔ وہ دن دور نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مڑ گئے اور باہر نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے:

"ویسے ابا جان! اس شخص کی نگرانی تو بہت ضروری ہے، کہیں یہ ہمیں الو نہ بنا رہا ہو۔"

"ہاں بالکل۔" یہ کہہ کر انھوں نے دفتر فون کیا اور چند سادہ لباس والوں کے لیے ہدایات دیں۔

"یہ کیس انکل خان رحمان کے سوٹ سے شروع ہوا تھا، پھر اس لاش نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کے بعد لاش کو جب غائب کر دیا گیا تو ہم اس زنجیر کی وجہ سے

ر کالا کے چکر میں پڑ گئے۔ لیکن پھر سوٹ کی طرف توجہ ں دے سکے۔ میرا مطلب ہے۔ ابھی تک ہم نے عرفان رزا سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے جسم پر وہ سوٹ کہاں ے آیا۔ جو اتفاق سے انکل خان رحمان کے پاس پہنچ گیا تھا۔"

از نے جلدی جلدی کہا۔

"اس وقت دعوت میں میں نے ان سے یہ سوال پوچھنا ب خیال نہیں کیا تھا۔ اب ہم علیحدگی میں اس سے یہ ال کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے، پھر کچھ سوچ کر انھوں ے کہا:

"بلکہ زیادہ بہتر یہ رہے گا کہ تم لوگ جا کر اس سے سوال کرو۔ مجھے ساتھ نہ لے جاؤ۔"

"بھلا یہ کیوں بہتر رہے گا؟"

"بھئی خان ڈابر ہمارا بہت گہرا دوست ہے۔ وہ محسوس

کرے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ ہمیں وہاں اتار دیں۔"

"ٹھیک ہے، اس دوران میں دو چار اور کام کر لوں گا۔"

"ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ کیس کسی کروٹ بیٹھے گا یا نہیں۔"

"ہاں! بیٹھتا نظر تو آ رہا ہے۔ دراصل مجرم کی سب

سے بڑی کوشش یہ ہے کہ ہم کوئی سُراغ نہ حاصل کر سکیں۔ اور
اب تک وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہا ہے۔"

"مشکل یہ ہے کہ ہم ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر پائے
کہ جُرم کیا کیا گیا ہے۔ آیا اس سوٹ کے ذریعے کوئی غیر قانونی
کام لیا گیا ہے یا کوئی اور چکر ہے۔" فرزانہ نے اُلجھن کے
عالم میں کہا۔

"ہم اس کیس میں کوئی بہت ضروری پہلو نظر انداز
کر رہے ہیں۔ جب بھی اس پہلو پر توجہ دیں گے، کیس
حل ہو جائے گا۔"

"اور وہ پہلو کون سا ہے؟" فاروق نے فوراً کہا۔

"اگر یہ معلوم ہو تو توجہ کیوں نہ دیں گے۔" انسپکٹر جمشید
مُسکرا کر بولے۔

"ایک اور بات ابّا جان۔ ہمارا ایک بہت زبردست اُصول
ہے۔ یہ کہ کیس کے دوران کیس سے کسی قسم کا بھی تعلق
رکھنے والے تمام لوگوں کو شک سے بَری نہیں سمجھتے۔
چاہے کسی کے مُجرم ہونے کا دور دور تک امکان نہ ہو۔
کیا ہم نے اس کیس میں اپنے اس اصول کو چھوڑ نہیں دیا۔"
فرزانہ نے پُراسرار انداز میں کہا۔

"کیا مطلب۔ بھلا ہم نے کس پر شک نہیں کیا؟" انسپکٹر

یہ چونکے۔

"ہم نے خان ڈابر پر کوئی شک اب تک نہیں کیا۔"

"ہوں! تمھاری بات بالکل ٹھیک ہے فرزانہ۔ لیکن بھئی۔
ب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ جرم کیا ہوا ہے، اس
ت تک ہم خان ڈابر کو تفتیش میں کس طرح شامل کر
تے ہیں۔ ایک سوٹ کا معاملہ ہے۔ اس بارے میں ہم نے
ر سے، درزی سے، کپڑے کی دکان سے اور اس مل
ے مالک سے جس کی مل میں کپڑا تیار ہوا، سوالات کیے
خان ڈابر سے بھلا اس معاملے میں کیا سوال کیا جائے،
م بتا دو۔"

فرزانہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے پاس اپنے والد کی
ت کا کوئی جواب نہیں تھا۔

" اس سے سوالات کرنے کا اگر کوئی پہلو ہے۔ تو تم
ال جا ہی رہے ہو۔ شوق سے خان ڈابر پر شک کر لینا
ر سوالات بھی۔" انھوں نے گویا انھیں کھلی چھٹی دی۔

انسپکٹر جمشید نے انھیں خان ڈابر کی کوٹھی کے پاس اتار
دیا۔ محمود نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ اچانک دروازہ کھلا
ر ایک نوجوان لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا، یہ خان ڈابر کی
ٹی تھی۔ دعوت کے دوران وہ اسے دیکھ چکے تھے۔

"اوہو! آپ لوگ ہیں۔ ڈیڈی سے ملنے آئے ہیں۔"

"یہی سمجھ لیں۔" محمود مسکرایا۔

"سمجھ لوں۔ کیا مطلب؟"

"ہم صرف خان صاحب سے نہیں۔ سبھی سے ملنے آئے ہیں۔ خاص طور پر، ہم عرفان صاحب سے ملیں گے۔"

"اوہ!" اس کا منہ بن گیا۔

"آپ نے تو منہ بنا لیا۔ کیا آپ کو مسٹر عرفان اچھے نہیں لگتے؟"

"آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں، میں تو پہلے ہی الجھن میں ہوں۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ الجھن میں ہیں؟"

"ہاں! ڈیڈی اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ رشتہ بچپن میں طے کر دیا تھا، لیکن آج کے دور میں بھلا بچپن میں کیے ہوئے رشتوں کو کوئی نبھاتا ہے۔ لڑکے لڑکی کی مرضی پوچھی جاتی ہے۔ لہٰذا میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ابا جان کو یہ مطالبہ ماننا چاہیے۔"

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہم اس بارے میں آپ کے ڈیڈی سے بات کریں۔"

"وہ کسی کی نہیں مانیں گے۔ ان کا ایک اصول ہے۔ فیصلہ کر لیا، بس کر لیا۔ پھر چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے، ان کا فیصلہ نہیں بدلے گا۔"

"ہوں۔ اچھی بات ہے۔ پھر آپ مسٹر عرفان سے بات کر لیں۔"

"وہ حضرت بھی نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے۔ یہ ان کے مرحوم والد کی خواہش تھی۔ ان کی خواہش کو وہ ضرور پورا کریں گے۔"

"ان حالات میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔ اوہو۔ میں نے آپ کو یہیں روک لیا۔ آپ اندر آئیے نا۔ یہ باتیں تو ہم اندر بیٹھ کر بھی کر سکتے ہیں۔"

"ہاں ضرور۔ ایک سوال اور۔ آپ کس سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"یہ ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ بہرحال میں اپنے ماموں کے بیٹے سے شادی کرنے کی خواہش مند ہوں، لیکن اگر ماموں کے بیٹے کو یہ رشتہ پسند نہ ہو تو میں ضد بھی نہیں کروں گی۔"

"آپ کی الجھن کا حل شاید ہمارے پاس ہو۔" فرزانہ نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"آپ کا نام مس سائرہ ڈابر ہے نا؟"

"ہاں! کیوں؟"

"آپ ایئر پورٹ پر گئی تھیں۔ مسٹر عرفان کو لینے؟"

"جی نہیں۔ چونکہ یہاں دعوت کے انتظامات کرنا تھے، عورتوں کا پورشن میرے ذمے تھا، اس لیے نہیں جا سکی تھی" سائرہ ڈابر نے کہا۔

"ہوں! خان صاحب بھی نہیں گئے تھے۔ تو پھر آخر انھیں لینے کون گیا تھا؟"

"انکل سرفراز جانی۔ ابّو کے مینجر۔"

"مسٹر عرفان نے اس بات کو محسوس تو کیا ہو گا؟" فرزانہ بولی۔

"ہاں! گلہ تو کر رہے تھے۔ میں نے اور ڈیڈی نے صفائی پیش کر دی تو مطمئن ہو گئے تھے۔"

"ہوں! ہم مسٹر عرفان سے ملنا چاہتے ہیں۔ دعوت کے دوران ان سے کوئی بات نہیں کر سکے تھے۔"

"آئیے میرے ساتھ۔"

اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک آواز نے انھیں چونکا دیا:

"اوہو۔ تم لوگ یہاں ہو۔ کمال ہے۔"

انھوں نے دیکھا، خان ڈابر چلے آ رہے تھے۔ نزدیک آ کر انھوں نے ان سے ہاتھ ملایا:

"انکل آپ کو معلوم ہے۔ ہمارے انکل خان رحمان جب آپ کے ہاں دعوت میں آ رہے تھے تو ان کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا تھا۔"

"کیسا واقعہ۔ کیا مطلب؟" انھوں نے چونک کر کہا۔

"وہ گھر سے نکلے اور کار میں بیٹھ کر آپ کی طرف روانہ ہوئے ہی تھے کہ کار کی پچھلی سیٹ سے کسی نے ان کی گردن پر پستول کی نال رکھ دی۔"

"ارے۔ کمال ہے۔ خان رحمان نے بتایا ہی نہیں۔"

"آپ مصروف تھے نا۔ انھوں نے آپ کو پریشان کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔"

"وہ پستول والا ان سے کیا چاہتا تھا؟"

"ایک عجیب چیز۔ پہلے وہ انھیں ایک سنسان سڑک پر لے گیا، پھر اس نے انھیں وہ سوٹ اتارنے کا حکم دیا۔ جو وہ پہن کر آئے تھے۔"

"کیا کہا۔ سوٹ؟" وہ حیران رہ گئے۔

"ہاں! سوٹ۔ انھوں نے سوٹ اتار کر اسے دے دیا اور خود وہ سوٹ پہن لیا جو وہ ساتھ لایا تھا۔ وہ سوٹ لے کر

چلا گیا۔"

"حیرت انگیز کہانی ہے۔"

"اس سے بھی حیرت انگیز بات ابھی اور بھی ہے۔ اور جب آپ وہ بات سُنیں گے تو اچھل ہی پڑیں گے۔"

"تو پھر بتاؤ نا بھئی۔ میں اچھل پڑنے کے لیے تیار ہوں۔" انھوں نے ہنس کر کہا۔

"انکل خان رحمان نے چند دن پہلے ایک سوٹ کا کپڑا خریدا تھا اور اپنے درزی کو سلنے کے لیے دے آئے تھے۔ وہ سوٹ ظہور سے گیا جل۔ ظہور صاحب نے سزا سے بچنے کے لیے ایک نیا سوٹ خریدا اور درزی کو دے دیا۔ اور اس سے جلد از جلد سی دینے کے لیے کہا۔ درزی نے سوٹ بہت جلد سی دیا۔ ظہور سوٹ گھر لے آیا۔ وہی سوٹ انکل خان رحمان پہن کر نکلے تو اس نامعلوم آدمی نے سوٹ اتروا لیا۔"

"عجیب کہانی ہے، لیکن سمجھ میں نہ آنے والی۔"

"اس سے بھی زیادہ ایک حیرت انگیز کہانی ہے۔"

"اور وُہ کیا؟" ان کے منہ سے نکلا۔

"پہلے ہم مسٹر عرفان سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں، پہلے مجھے وُہ حیرت انگیز بات کیوں نہیں بتا دیتے۔"

"وہ ہے ہی اس قدر حیرت انگیز کہ ہم مزے لے

لے کر بتانا چاہتے ہیں۔"

"جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ آئیں چلیں۔"

وہ عرفان کے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ خان صاحب نے دستک دی۔ اندر سے اُٹھتا ہوا موسیقی کا شور یک لخت بند ہو گیا اور عرفان کی آواز ابھری:

"کون؟"

"میں ہوں بیٹے۔ اور میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔"

"ایک منٹ انکل۔ میں ذرا درست لباس میں نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ پہن لو۔"

ایک منٹ بعد دروازہ کھلا۔ عرفان کی شکل دکھائی دی۔ اس کے جسم پر اب بھی وہی سوٹ تھا۔ یہ دیکھ کر انھیں قدرے حیرت ہوئی۔

"آپ لوگوں کو تو شاید میں دعوت میں دیکھ چکا ہوں۔"

"ہاں عرفان! یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں، انسپکٹر جمشید کے بچے۔ تم سے ملنے آئے ہیں۔"

"آیئے۔ تشریف لایئے۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ تشریف لائے۔"

وہ اس کے کمرے میں بیٹھ گئے۔

"ہاں بھئی وُہ حیرت انگیز کہانی کیا ہے؟" خان ڈابر نے کہا۔

"جی کیا مطلب۔ کیسی کہانی؟"

"اب انھیں بھی ساری بات بتانا پڑے گی۔" محمود نے بے چارگی کے عالم میں خان ڈابر کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ۔ بتائیں۔"

انھوں نے ظہور کی کہانی سنا ڈالی، پھر اس نامعلوم آدمی کی بھی جس نے پستول کی زد پر سوٹ خان رحمان کے جسم سے اتروایا تھا، پھر اس کی لاش ملنے کی تفصیلات بتائیں۔

"کہانی واقعی حد درجے حیرت انگیز ہے، لیکن یہ کہانی مجھے کیوں سنائی جا رہی ہے؟"

"اس لیے کہ اب وہی سوٹ آپ کے جسم پر موجود ہے۔"

"کیا!!" خان ڈابر اور عرفان زور سے اچھلے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

خوف ہی خوف

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے۔ آخر عرفان شیرازی کے ہونٹ ہلے:

"یہ کیا بات ہوئی۔ کسی مل میں ایک قسم کا ہزاروں گز کپڑا بنتا ہے، اب وہ ایک ہی آدمی تو نہیں خریدتا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے کب کہا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ نے یہ کیوں کہا کہ میرے جسم پر اس وقت وہی سوٹ ہے۔" عرفان کا لہجہ ناخوش گوار تھا۔

"دراصل میرے منہ سے غلط جملہ نکل گیا۔" محمود نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"کیا مطلب ۔ آپ اس کے بجائے کیا کہنا چاہتے تھے۔"

"یہ کہ آپ کے جسم پر اس وقت بالکل ویسا ہی سوٹ ہے۔"

"ارے ہاں! اب ٹھیک ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ ایک حیرت انگیز اتفاق ہے۔ ہے نا؟" فاروق مسکرایا۔

"نہیں تو۔ عام بات ہے۔"

"ہو سکتا ہے ۔ یہ عام بات ہے، لیکن ہمیں نہیں محسوس ہو رہی۔ اچھا، آپ نے یہ کپڑا کہاں سے خریدا تھا؟"

"میں نے۔ انشارجہ میں رہتے ہوئے، ظاہر ہے، وہیں سے کپڑے خرید سکتا تھا۔ اور وہیں سے سلوا سکتا تھا۔"

"بہت خوب۔ آپ کے پاس اس دکان کی رسید تو ہو گی۔ اور اس سوٹ پر اس درزی کا مونوگرام بھی ہو گا۔ وُہ دکھا سکتے ہیں آپ۔"

"میں نے مونوگرام پر توجہ نہیں دی۔ اور رسید بھی کیوں سنبھال کر رکھتا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھ سے یہاں اس قسم کے سوالات پُوچھے جائیں گے۔"

"آپ شاید ناراض ہو گئے۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں! ہونا ہی چاہیے۔ آخر اس قسم کے سوالات سے میرا کیا تعلق ہے۔"

"آپ یہ بھی تو سوچیں کہ ہم کس قدر عجیب حالات کا شکار ہیں۔ ان حالات میں جب بالکل وہی یا بالکل ویسا ہی سوٹ کسی کے جسم پر نظر آئے تو ہم اُلجھن میں مبتلا ہو جائیں گے یا نہیں۔ اور اُلجھن میں مبتلا ہم دعوت میں ہی ہو گئے تھے، لیکن اس موقعے پر ہم نے خاموشی ہی اختیار کیے رکھی۔"

"آپ کی بہت مہربانی کہ اس موقعے پر یہ باتیں نہیں کیں۔ ورنہ نہ جانے کتنے لوگ مجھے گھورتے۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ارے ہاں۔ مسٹر عرفان۔ ہے تو یہ بُری بات اور بدتمیزی بھی۔ لیکن ہم بھی کیا کریں۔ مجبور ہیں۔ ذرا یہ کوٹ اتار کر دکھائیں گے۔" محمود نے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ بُری بات ہے اور بدتمیزی بھی۔"

"آخر یہ یہاں ہو کیا رہا ہے انکل۔" عرفان نے غرا کر خان ڈابر سے کہا۔

"بھئی محمود ۔ میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔" خان ڈابر نے ناخوش گوار انداز میں کہا۔

"بہت بہتر انکل۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ان سے رُخصت ہو کر باہر نکل آئے۔

"کیا خیال ہے؟"

"دال میں کچھ کالا ہے۔" عرفان کافی حد تک پریشان ہو

گیا تھا۔ جب میں نے کہا کہ کوٹ اتار کر دکھا دیں۔"

"تب تو پھر کوٹ کو دیکھنا بہت ضروری ہے۔" فرزانہ
نے مسکرا کر فاروق کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں! میں سمجھ رہا ہوں۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"کیا سمجھ رہے ہو بھئی۔ اور یہ تم اتنے سمجھ دار کب
سے ہو گئے۔" محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ کہ اب رات کو پائپ پر چڑھ کر خان ڈابر کے
ہاں داخل ہونا پڑے گا اور اس کوٹ کا معائنہ کرنا
پڑے گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ تم تو واقعی ...."

"بس بس۔ رہنے دو۔" فاروق جل گیا۔

رات تاریک تھی اور تین سائے خان ڈابر کی کوٹھی
کے پچھلے حصے کے باہر کھڑے تھے۔ ایک پائپ اوپر چھت
تک جا رہا تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔ تم پائپ کے ذریعے آنا پسند کرو
گے یا جا کر تمہارے لیے دروازہ کھولوں۔"

ھئی دروازہ ہی کھول دینا۔ ورنہ اس طرح تمہیں چھت پر
ے رہ کر ہمارا انتظار کرنا ہوگا۔"

"بہت آرام پسند اور کام چور ہو۔" اس نے بھنا کر کہا
پائپ پر چڑھتا چلا گیا۔ پھر وہ زینے کے ذریعے نیچے
۔ زینے کا دروازہ اگر بند ملتا تو بھی اس کے لیے کوئی
شانی والی بات نہیں تھی، وہ ریشم کی ڈوری لٹکا کر اتر
تھا۔ جلد ہی نیچے ایک دروازہ کھلا اور الو کی ہلکی
آواز لہرائی۔ محمود اور فرزانہ اس طرف لپکے اور پھر اندر
ہو گئے۔ کوٹھی میں کئی جگہ زیرو کے بلب جل رہے
وہ دبے پاؤں آگے بڑھے اور عرفان شیرازی کے دروازے
نچے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

"چلو فاروق۔ یہ کام بھی تم کرو۔"

سارے کام مجھ سے ہی لیتے رہنا، خود کوئی کام نہ کرنا۔"
نے تلملا کر سرگوشی کی۔

پھر جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر تالے کے سوراخ
لک گیا۔ آخر ایک چابی لگ گئی۔ ہلکی سی کلک کی آواز
دی۔ اور پھر وہ دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو
۔ اندر مسہری پر عرفان شیرازی سو رہا تھا۔ سوٹ اس
رہانے رکھی الماری میں لٹک رہا تھا۔ انھوں نے آواز

پیدا کیے بغیر سوٹ الماری سے نکال لیا اور اس کا جائزہ
لینے لگے۔ محمود نے تو اس کو پہن کر بھی دیکھا، لیکن کوئی
بات سمجھ میں نہ آئی۔

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔" ایسے میں فرزانہ
محمود کے کان میں کہا۔

"چلو بتاؤ۔" محمود نے منہ بنایا۔

"کوٹ کو یہاں سے اڑا لے جاتے ہیں۔"

"اوہ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

وہ دبے پاؤں باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر بعد آندھی
اور طوفان کی رفتار سے وہ اڑے جا رہے تھے۔ ایسے میں
ایک کانسٹیبل نے انھیں رکنے کا اشارہ کیا:

"یہ حضرت رات کے بارہ بجے کیا اشارے کنٹرول کر
رہے ہیں۔" محمود نے جھلا کر کہا اور گاڑی روک دی:

"ہاں جناب۔ کیا حکم ہے؟"

"آدھی رات کو کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو
چلو تھانے۔"

"ہمیں بہت ضروری کام ہے۔ پہلے وہ کر آئیں۔ پھر
تھانے چلے چلیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ اچھا، نکالو دو سو روپے

اس نے فوراً کہا۔

"اتنی جلدی آپ کا مطالبہ بدل گیا۔ آپ کا نام کیا
ہے؟" محمود بولا۔

"تمھیں میرے نام سے کیا؟"

"جلدی سے نام بتاؤ۔ ورنہ اسی وقت تمھاری چٹنی بنا
دیں گے۔" محمود نے غرّا کر کہا۔

کانسٹیبل نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا، پھر جونہی اس
کی نظر کار کی نمبر پلیٹ پر پڑی، بوکھلا گیا:

"آپ۔ آپ جائیے سر۔"

"اب ایسے تو ہم نہیں جائیں گے۔ آدھی رات کو لوگوں
کو پریشان کر رہے ہو اور ہم چلے جائیں۔"

آخر اس کا نام وغیرہ نوٹ کر کے وہ آگے بڑھے۔
اور سیدھے تجربہ گاہ پہنچے۔ انھیں پورے ایک منٹ تک گھنٹی
بجانا پڑی۔ تب کہیں جا کر شائستہ کی آواز سنائی دی:

"اوہو کیا مصیبت ہے بھئی۔ آ رہی ہوں۔"

"ہمارا نام مصیبت نہیں۔" فاروق چہکا۔

"ہائیں۔ یہ تو فاروق بھائی کی آواز ہے۔"

"کان بجے ہوں گے تمھارے۔"

"ارے۔ محمود بھائی بھی ہیں۔"

"بلکہ فرزانہ بھی ہے، لیکن یہ دروازہ کب کھلے گا؟"

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا:

"ہاں ٹھیک ہے۔ یہ تو واقعی تم ہو۔" شائستہ پھر حیران ہو کر بولی:

"لیکن یہ آنے کا کون سا وقت ہے، دن میں نہیں آسکتے تھے؟"

"دن میں بھی آجائیں گے۔ انکل کہاں ہیں؟"

"سو رہے ہیں۔ گھوڑے بیچ کر۔"

"ان میں بس یہی خرابی ہے - جب سوتے ہیں، گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں - حالانکہ وہ یہ کام نہیں کرتے۔"

"کون، کون سا کام نہیں کرتا؟" پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔

"ہائیں شائستہ - یہ تو جاگ رہے ہیں۔"

"تمھاری خوشبو نے انھیں جگا دیا شاید۔" شائستہ مسکرائی۔

انھوں نے پروفیسر داؤد سے مصافحہ کیا:

"یہ کوٹ کیسا اٹھائے پھر رہے ہو؟"

"یہ کوٹ ہی آپ کو دکھانے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب - میں کوئی درزی ہوں - یا کپڑے کا کام کرتا ہوں - اور پھر اگر دکھانا ہی تھا تو دن میں نہیں دکھا سکتے تھے؟"

"بات دراصل یہ ہے انکل کہ ہم یہ کوٹ چرا کر لائے ہیں۔"

"کیا کہا - چرا کر لائے ہو - تم نے یہ کام کب سے شروع ردیا؟"

"ایسے کام تو ہم ضرورت کے تحت کرتے ہی رہتے ہیں کل۔" فاروق نے کہا۔

"ہوں - چکر کیا ہے؟" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔

"بس آپ اس کو اچھی طرح چیک کر دیں - اس میں کوئی اص بات تو نہیں ہے۔"

"اچھی بات ہے - ابھی لو۔"

یہ کہ کر وہ تجربہ گاہ میں چلے گئے۔

"کوٹ کا کیا چکر ہے بھئی؟"

"کوئی بہت گہرا - جو اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا، لہذا م نے سوچا کہ انکل سے بھی مشورہ کرلیں۔"

"کہانی کیا ہے بھئی - یہ تو بتا ہی سکتے ہو۔"

انھوں نے ساری کہانی بیان کر دی - اسی وقت پروفیسر داؤد ندر داخل ہوئے:

"تم شاید خان ٹڈابر کا ذکر کر رہے تھے۔"

"جی ہاں - اس میں کوئی خاص بات نظر آئی یا نہیں؟"

"ہاں بھئی - یہ تو بہت خاص کوٹ ہے۔"

"جی - کیا مطلب؟"

"تم اسے کمپیوٹر کوٹ کہہ سکتے ہو۔"

"کیا کہا۔ کمپیوٹر کوٹ" وہ ایک ساتھ بولے۔

"ہاں! کمپیوٹر کوٹ ۔ معلومات کا ایک خزانہ اس کوٹ میں بھر دیا گیا ہے۔ یوں کہہ لو کہ اچھا بھلا چلتا پھرتا کمپیوٹر ہے یہ۔ جس شخص کے لیے بنایا گیا ہے۔ وہ جب چاہے اس کوٹ سے کوئی بات پوچھ سکتا ہے۔ اور کوٹ اس کے کان میں اس سوال کا جواب بتا دے گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔ کیا ایسا ممکن ہے؟"

"اس دور میں یہ مشکل بھی کیا ہے۔"

"لیکن سوال پوچھنے کے لیے منہ سے آواز تو نکالنا پڑے گی۔" فاروق بولا۔

"نہیں۔ کوٹ کا اوپر والا حصہ دماغ کی نسوں سے چپک جاتا ہے۔ وہ آدمی جو سوال سوچتا ہے۔ کوٹ اس کا جواب اس کے دماغ میں ڈال دیتا ہے۔"

"نہیں۔" وہ چلا اٹھے۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ اس کیس میں یہ حیرت انگیز ترین انکشاف ہوا تھا اور غالباً پہلی بار کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تھی۔

"اس لحاظ سے تو اس کوٹ کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہا جا سکتا ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

کر سکتے ہو۔ مجھے بھلا کیا اعتراض۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

انھیں پروفیسر داؤد کو بھی کہانی سنانا پڑی:

"انتہائی حیرت انگیز کہانی۔ جس قدر کوٹ حیرت انگیز، اتنی ں کی کہانی حیرت انگیز۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اور اس کا مطلب ہے ۔ یہ سارا چکر عرفان شیرازی نے ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ کیوں، اسے کیا ضرورت تھی یہ چکر چلانے

"دوسرے یہ کہ ۔ وہ کوئی سائنس دان تو ہے نہیں ۔

"ارے مگر۔ وہ انجنیئر تو ہے ۔ اور یہ کام بھی انجنیئرنگ ہے۔"

"چلو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایسا کوٹ بنا سکتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

"معاملہ اب مزید الجھ گیا ہے۔ کیوں نہ اس بارے میں ن سے بات کر لی جائے۔"

"فون پر بات کر لیتے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

محمود نے گھر کے نمبر ملائے:

"ہاں بھئی، کیا بات ہے؟" دوسری طرف سے فوراً انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔

"ہم کوٹ پار کر لائے ہیں اور اب پروفیسر انکل کے

ہاں سے بات کر رہے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہم نے کوٹ کو انکل سے چیک کرایا ہے۔ اب وہ س
لیں جو انھوں نے کوٹ کے بارے میں بتایا ہے۔"

یہ کہ کر اس نے وضاحت کر دی:

"نن۔نہیں۔" انسپکٹر جمشید ہکلائے۔

"نہیں۔ کیا مطلب۔ آپ نے یہ نہیں کس سلسلے میں بولا

"مارے حیرت کے بولا ہے۔ یہ تو معاملہ ہی اور نکل آ
اب تمھیں عرفان شیرازی کو چیک کرنا ہے۔"

"گویا آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟"

"نہیں! اب میں ذرا دُور رہ کر اس کیس کا جائزہ لوں گ
کیونکہ مجھے بہت مزا آ رہا ہے۔"

"جی۔ مزا آ رہا ہے۔"

"ہاں۔ واقعی آ رہا ہے۔"

"لیکن ابا جان! یہ مزا کم بخت ہماری طرف کیوں نہیں
آ رہا؟"

"اس لیے کہ تم عقل استعمال نہیں کر رہے۔ جب عقل
استعمال کرو گے تو پھر تمھیں بھی بہت زیادہ مزا آئے گا۔
کیا سمجھے؟"

"ہم ابھی اور اسی وقت عقل کا استعمال شروع کر دیتے
ہیں۔ آخر فرزانہ ہمارے ساتھ ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ ضرور کرو۔ میں تمھیں نہیں روکوں گا،
اب اس کیس کے سلسلے میں تم جو جی میں آئے، کرو۔" انھوں نے
گویا کھلی چھٹی دی۔

"بہت بہت شکریہ ابا جان۔"

ریسیور رکھ کر وہ ان کی طرف مُڑا:

"آؤ بھئی عقل استعمال کریں۔ ابا جان کا کہنا ہے کہ ہم
عقل استعمال نہیں کر رہے۔ شاید وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے
کہ کوٹ کے بارے میں یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد تو
معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔"

"فرض کر لیتے ہیں۔ یہ کوٹ یا سوٹ عرفان شیرازی انشارجہ
سے بنا کر لایا ہے۔ تو پھر یہاں سوٹ کا چکر کیوں چلا۔
اس صورت میں تو یہاں کسی چکر کی ضرورت نہیں تھی۔" فرزانہ
نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"تب پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کوٹ یہاں تیار
کیا گیا اور اسے یہاں آنے پر دیا گیا۔" محمود نے پُرجوش
انداز میں کہا۔

"ہاں! بالکل یہی بات نظر آتی ہے۔ اور اس طرح یہاں

"جو سوٹ کا چکر چلا۔ وہ بھی فٹ بیٹھتا نظر آتا ہے۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن اب ہم واقعات کو ترتیب کس طرح دیں۔" محمود نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"اس سلسلے میں مَیں تمھاری مدد کیے دیتی ہوں۔ یہ سوٹ عرفان شیرازی کے لیے سلوایا گیا، لیکن غلطی سے سوٹ ظہور کو دے دیا گیا، کیونکہ بالکل اسی قسم کا کپڑا ظہور نے انکل خان رحمان کے لیے خرید لیا تھا۔"

"واہ۔ مزا آنے لگا ہے۔ ابّا جان ٹھیک کہہ رہے تھے۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"چلو شکر ہے۔ اب مزا کم بخت نہیں رہا۔" فاروق بولا۔

"ظہور انکل سوٹ گھر لے آئے۔ اب سوٹ جس نے سلنے کے لیے دیا تھا، وہ درزی کے پاس گیا تو اس کا سوٹ وہاں نہیں تھا اور اس کی بجائے اس جیسا دوسرا تھا۔ اس نے درزی کو بتایا کہ کیا غلطی ہو گئی ہے۔ پھر اس سے خان رحمان کا پتا معلوم کیا اور ان کے گھر کی طرف آ گیا۔ شاید اسے یہ بھی معلوم تھا کہ خان رحمان دعوت میں شریک ہوں گے۔ لہٰذا وہ کار میں چھپ گیا۔ اور اس طرح اس نے سوٹ ان سے حاصل کر لیا۔ اور پھر

نے وہ سوٹ عرفان شیرازی کے حوالے کر دیا۔"

"لیکن کب؟" فاروق نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"اوہ! یہ تو ایک اور عجیب بات نکل آئی۔ کوٹ اسے کب دیا گیا۔"

"صاف ظاہر ہے۔ ایرپورٹ پر دیا گیا۔ اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔" فرزانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

محمود اور فاروق بھی سکتے کے عالم میں رہ گئے، کیونکہ وہ جان گئے تھے۔ سوٹ اسے کس نے دیا ہوگا۔ اگر وہ اس کیس میں شریک نہیں تھا تو پھر وہ اس بات کو خان ڈابر سے ہرگز نہ چھپاتا۔

"جہاز سے اترنے والے ہر آدمی پر استقبال کرنے والوں کی نظریں لگی ہوتی ہیں۔ جہاز سے اُتر کر باہر نکلنے تک تو نہ سوٹ اسے دیا جا سکتا تھا اور نہ سوٹ تبدیل کر سکتا تھا۔ صاف ظاہر ہے۔ اسے راستے میں سوٹ تبدیل کروایا گیا۔ یعنی کار میں۔"

"آخر ہم مجرم تک پہنچ گئے، لیکن یہ بات اب تک ہم نہیں جان سکے کہ اس نے یہ سارا چکر کیوں چلایا۔"

"عقل کے گھوڑے اگر دوڑا لیے جائیں تو یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن ان سب پر تو تم نے قبضہ کر رکھا ہے۔" فاروق نے جلا کر کہا۔

"کن پر قبضہ کر رکھا ہے؟" پروفیسر داؤد بے خیالی کے عالم میں بولے۔

"عقل کے گھوڑوں پر۔" فاروق بولا۔

"اوہ!" پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا۔

"ہمیں اسی وقت ان کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ جونہی انھیں سوٹ کی گم شدگی کی خبر ملے گی، وہ فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن سوٹ کی گم شدگی کی اطلاع انھیں صبح سے پہلے نہیں ہو گی۔"

"لیکن ہمیں دو ایک سادہ لباس والوں کو تو مقرر کر ہی دینا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک اور رات کا باقی حصہ تم یہیں گزارو گے۔ سنا تم نے۔" پروفیسر صاحب نے آنکھیں نکالیں۔

"ج۔ جی۔ بہتر۔" فاروق نے سہم کر کہا۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ خان ڈابر کے ہاں پہنچ گئے،

انھوں نے حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا:

"خیر تو ہے۔ آج بہت صبح سویرے آ گئے۔"

"کیا کریں انکل، مجبوری ہے۔"

"مجبوری کیسی؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا، پھر چونک کر بولے:

"اور جمشید نظر نہیں آ رہے تمھارے ساتھ؟"

"وہ دوسری طرف مصروف ہیں۔"

"خیر۔ بات کیا ہے؟"

"سوٹ کا مسئلہ قریب حل ہو گیا۔ آپ ذرا عرفان صاحب کو بلا لیں۔"

"حل ہو گیا۔ کیا واقعی؟"

"ہاں جناب۔ آپ پہلے عرفان صاحب کو بلا لیں۔ اور باقی لوگوں کو بھی یہیں بلا لیں۔"

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد سب لوگ وہاں پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم میں انھیں بٹھایا گیا۔ ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"مسٹر عرفان۔ آپ کا وہ سوٹ کہاں ہے؟"

"رات کسی نے چرا لیا۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"کیا کہا۔ چرا لیا۔ تم نے مجھے بتایا تک نہیں کہ ہمارے

گھر میں چوری کی واردات ہو گئی ہے۔"

"بتانے کے لیے آ ہی رہا تھا کہ آپ کا پیغام مل گیا۔"

"ہوں۔ آپ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں، بات کریں۔" خان ڈابر ان کی طرف مڑا۔

"پہلی بات تو یہ کہ سوٹ رات ہم نے ہی چرایا ہے۔"

"کیا!!!" وہ اچھل پڑے۔

اور پھر عرفان شیرازی کی آنکھوں میں خوف ہی خوف سمٹ آیا۔

کیا مطلب

"لیکن بھئی۔ آپ لوگوں کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" خان ڈابر نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"ہمیں کوٹ کا معائنہ کرانا تھا۔"

"معائنہ کرانا تھا۔ لیکن کس سے؟" وہ بولے۔

"اپنے انکل پروفیسر داؤد صاحب سے۔ جو ہمارے ملک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے، آخر بولے:

"تو پھر۔ آپ نے معائنہ کرایا؟"

"ہاں: انھوں نے معائنے کے بعد بہت ہی حیرت انگیز باتیں بتائی ہیں۔ یہ سوٹ کمپیوٹرائزڈ سوٹ ہے۔ جب اسے کوئی آدمی پہن لیتا ہے۔ تو گویا وہ معلومات کا خزانہ بن جاتا ہے۔ اس سے جو سوال بھی پوچھا جائے گا۔ وہ اس سوٹ سے پوچھ کر دوسروں کو بتا دے گا اور یہ عمل اس

طرح ہو گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

"حیرت ہے۔ ایسی بات میں نے پہلی بار سُنی ہے۔"

"چلیے شکر کریں۔ سُن تو لی۔"

"آپ نے شاید ابھی تک غور نہیں کیا۔ ہمارے عرفان صاحب کو آخر ایسے کسی کوٹ کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"ہاں بھئی عرفان۔ یہ تم بتاؤ۔"

"مم۔ مجھے نہیں معلوم۔ اس سوٹ میں کوئی ایسی بات ہے۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"تو پھر آپ اس کے لیے اتنے پریشان کیوں تھے۔ صرف ایک سوٹ کے لیے تو آپ جتنے دولت مند لوگ پریشان نہیں ہو سکتے۔"

"اس میں میرے کچھ قیمتی کاغذات بھی تھے۔"

"جی نہیں۔ وہ کاغذات ہم دیکھ چکے ہیں، ہرگز قیمتی نہیں ہیں۔ عام کاغذات ہیں۔"

عرفان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا:

"اچھا خیر۔ اب آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ۔ یہ سوٹ خاص طور پر عرفان صاحب کے لیے بنوایا گیا تھا، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بالکل اسی جیسا سوٹ انکل خان رحمان کا ملازم ظہور بھی سلنے کے لیے دے گیا۔

ر اس طرح دوسرا سوٹ ظہور کو دے دیا گیا۔ انھیں جب اس
لی کا پتا چلا تو ایک شخص خان رحمان صاحب سے سوٹ حاصل
رنے پہنچ گیا۔ انھیں سوٹ پہن کر آپ کی دعوت میں آنا
تھا۔ یہ بات بھی اسے معلوم تھی۔ لہٰذا وہ ان کی کار میں
چھپ گیا اور پھر پستول کے ذریعے سوٹ اتروا لیا۔ بعد
میں اس کی لاش سڑک پر سے ملی۔ گویا جس نے سوٹ اس
کے ذریعے حاصل کیا تھا، اس نے اسے زندہ بھی نہیں چھوڑا
کہیں وہ یہ بات کسی کو بتا نہ دے اور اس کا بھانڈا نہ
پھوٹ جائے۔ بلکہ وہ ہم سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس
نے بعد میں مُردے کو بھی غائب کرا دیا۔ اور غائب کرنے
والے سے یہیں غلطی ہوئی۔ وہ اپنی زنجیر وہاں گرا آیا۔
اس زنجیر کی وجہ سے ہم اس تک پہنچ گئے، لیکن اس نے
آخری لمحات میں بھی ہمیں دھوکا دیا اور غلط آدمی کا نام
ہمیں بتا دیا۔ خود اصل مجرم کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"آخر آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ یہ سارا چکر کس
لیے چلایا گیا۔ کیا یہ میں نے کیا ہے؟" خان ڈابر نے بھنا
کر کہا۔

"ہاں خان صاحب۔ یہ سارا کیا دھرا آپ کا ہے۔" محمود
نے منہ بنا کر کہا۔

"نن ۔ نہیں ۔ یہ ۔ یہ بالکل غلط ہے ۔ بالکل جھوٹ۔" خان ڈابر چلّائے ۔

"آہستہ بات کریں خان صاحب ۔ آپ نے اپنی بیٹی کا رشتہ بچپن میں ہی اپنے دوست اور کاروباری شریک کے بیٹے عرفان سے کر دیا تھا، لیکن بعد میں آپ کو پتا چلا کہ آپ کی بیٹی تو اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی ۔ لہٰذا آپ نے سوچا ۔ عرفان کو کسی چکر میں الجھا دیا جائے ۔ تاکہ وہ قانون کے شکنجے میں آ جائے ۔ اس سے دو فائدے ہوں گے، ایک تو بیٹی کو چھٹکارا مل جائے گا، دوسرے اس کے حصے کی دولت بھی ہاتھ آئے گی۔"

"نن ۔ نہیں ۔ نہیں۔" وہ چلّائے ۔

"اگر یہ بات درست ہے تو پھر اس کوٹ کا چکر کیوں چلایا گیا؟" سرفراز جانی نے منہ بنایا ۔

"تاکہ قانون کی نظروں میں عرفان ہی مجرم ہو۔"

"تو پھر ۔ مجرم آخر کون ہے؟" عرفان نے سنبھل کر کہا ۔

"بتا تو دیا ہے ۔ مجرم ہیں ہمارے انکل خان ڈابر۔"

"کہیں تم لوگ مذاق تو نہیں کر رہے۔" خان ڈابر نے بوکھلا کر کہا ۔

"اگر آپ کا خیال یہ ہے تو پھر سُن لیں ۔ ہم واقعی

ق کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ سب حیران رہ گئے ۔

"ذرا مجرموں کا دل راضی کر رہے تھے ۔ بلکہ وہ کہانی کو ں رُخ بٹھانا چاہتے تھے، اسی رُخ سے پیش کر رہے تھے۔"

"اس طرح آپ لوگ میری اُلجھن میں مزید اضافہ کر ہے ہیں۔" وہ بولے ۔

"اچھا تو پھر غور کر لیں ۔ بات تو بالکل سامنے کی ہے ۔ ال سے، عرفان صاحب کو لینے کون گیا تھا؟"

"سرفراز جانی ۔ میرے مینیجر۔"

"ہم کب انھیں اپنا مینیجر کہہ رہے ہیں۔" فاروق نے منہ نا کر کہا ۔

"یہی گئے تھے۔"

"اگر یہ اس معاملے میں شریک نہیں ہیں تو پھر سوٹ رفان صاحب نے کب پہنا؟"

"اوہ اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔

"جانی ۔ تم خاموش ہو ۔ بولو نا ۔ عرفان نے سوٹ کب پہنا؟"

"مجھے نہیں معلوم ۔ جب یہ جہاز سے اُترے ۔ اسی سوٹ یں تھے۔" اس نے بھنّا کر کہا ۔

"اگر یہ اسی سوٹ میں تھے تو پھر یہاں سوٹ کا چکر

کیوں چلا؟"

" بھلا میں کیا جانوں۔"

" آپ لوگ اس بات کی کیا وضاحت کرتے ہیں۔" خان ڈابر
ان کی طرف مڑے۔

" یہ کہ جہاز ایک گھنٹا لیٹ نہیں تھا۔ جب کہ آپ کو
سرفراز جانی نے ایرپورٹ سے فون کیا تھا کہ جہاز ایک
گھنٹا لیٹ ہے۔"

" اوہ ہاں واقعی۔ یہ فون تو اس نے کیا تھا۔" خان ڈابر
نے کہا۔

" جب کہ جہاز بالکل لیٹ نہیں تھا۔ ایک گھنٹا کسی جگہ
کار روک کر عرفان صاحب کو سوٹ پہنایا گیا اور اس کے بارے
میں اسے ٹریننگ دی گئی، باقی باتیں بھی سمجھائی گئیں۔"

" اوہ اوہ۔" خان ڈابر دھک سے رہ گئے۔

" یہ تصدیق تو ایرپورٹ سے بآسانی کی جا سکتی ہے کہ
جہاز ایک گھنٹا لیٹ تھا یا نہیں۔" محمود نے کہا۔

" اب تم کیا کہتے ہو سرفراز جانی؟"

" مم۔ میں۔ میں کیا کہوں۔ یہ کام میں نے نہیں کیا۔ ان
لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

" اچھا۔ اگر ہمیں غلط فہمی ہوئی ہے تو حوالات کی سلاخوں

پ کی انگلیوں کے نشانات کیوں ہیں۔ جس میں امیر کالا
ا ملا ہے۔"

" نن۔ نہیں۔" سرفراز جانی زور سے چلایا۔

" دیکھ لیا آپ نے۔ اس کو کہتے ہیں، جرم کا اقرار۔"

" واقعی۔ کمال ہے۔" خان ڈابر نے حیران ہو کر کہا۔

" اب سوال صرف ایک رہ گیا۔ عرفان شیرازی اور سرفراز
ں نے مل کر یہ چکر کیوں چلایا۔ انھیں ایسا کرنے کی آخر
ورت کیا تھی؟

" یہ تو واقعی بہت گہرا سوال ہے۔" خان ڈابر بولے۔

" اس کی گہرائی کو ابا جان ہی کم کریں گے آکر۔" فرزانہ نے
کرا کر کہا۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی:

" لیجیے۔ اِدھر ان کا نام لیا، اُدھر وہ آ گئے۔" محمود نے
کرا کر کہا اور اُٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ وہ لوٹا تو
پکٹر جمشید اس کے ساتھ تھے:

" معلوم ہوتا ہے۔ تمام تفصیلات بتائی جا چکی ہیں۔"

" صرف یہ تفصیل رہ گئی ہے کہ یہ چکر چلایا کیوں گیا۔
ں کی ضرورت کیا تھی؟"

" میرا بھی خیال یہی تھا۔ کہ آپ لوگ اس بات کی تہ

تک نہیں پہنچ سکیں گے ۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ ۔ تم نے یہ اندازہ تو لگا ہی لیا ہو گا کہ جہاز ایک گھنٹا لیٹ نہیں تھا۔"

"جی ہاں بالکل ۔ بلکہ ہم تو یہ اندازہ بھی لگا چکے ہیں کہ حوالات کی سلاخوں پر قاتل کی اُنگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔"

"ہاں ! یہ بات غلط نہیں ہے ۔ اکرام نے اُنگلیوں کے نشانات اٹھوا لیے تھے ۔ گھر کے تمام افراد کی اُنگلیوں کے نشانات وہ پہلے ہی اٹھا چکا ہے ۔ اور ملانے کے بعد رپورٹ مجھے دے چکا ہے ۔ دونوں نشانات مل گئے ہیں ۔ لہٰذا سرفراز جانی نے امیر کالا کو ہلاک کیا ہے ۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔"

عین اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر گھر کا ملازم اندر داخل ہوا :

"صاحب جی ۔ بی بی صاحبہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں ۔ تو پھر کیا ہوا ۔ کسی اور کمرے میں ہوں گی۔" خان ڈابر بولا۔

"جی نہیں ۔ وہ ان کی ایک سہیلی ملنے آئی ہیں نا ۔ اس سلسلے میں میں نے انھیں اِدھر اُدھر ہر جگہ دیکھا ہے، لیکن وہ گھر میں کہیں بھی نہیں ہیں۔"

"یا اللہ رحم۔" خان ڈابر کے منہ سے نکلا۔

"کیوں بھئی ۔ سائرہ صاحبہ کہاں ہیں؟" محمود نے سرفراز جانی کی طرف دیکھا۔

"دُور ۔ بہت دُور۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"سائرہ کو پانے کے لیے اب تم لوگوں کو ہماری شرائط ماننا ہوں گی ۔ جب رات تم نے سوٹ چرایا ، میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اب گھی سیدھی اُنگلیوں سے نہیں نکلے گا، لہٰذا میں نے بھی اسے رات کو ہی غائب کروا دیا۔" اس نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"تم نے وہ سوٹ کس سے بنوایا تھا ۔ میرا مطلب ہے، اس کپڑے میں کمپیوٹر سسٹم کس طرح شامل کیا گیا ہے؟"

"یہ کام میں نے ایک غیر مُلکی سائنس دان سے لیا تھا ، بھاری قیمت ادا کر کے۔"

"لیکن اس کی ضرورت کیا تھی؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

سرفراز جانی خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا :

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"لیکن جمشید ۔ آپ اس سے میری بچی کے بارے میں پوچھیں نا۔"

"اس کے بارے میں بھی پوچھ لیتے ہیں ۔ ہاں مسٹر ۔

اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"نہیں بتاؤں گا۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"اگر نہیں بتاؤ گے تو پھر میں بتاؤں گا۔"

"اور میری بچی؟" خان ڈابر نے گھبرا کر کہا۔

"وہ جہاں کہیں بھی دیکھی گئی ہیں۔ خیریت سے ہی ہوں گی۔ یہ لوگ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔"

"لیکن اگر ہمارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو پھر اس کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کی جائے گی۔" سرفراز جانی نے غرّا کر کہا۔

"خیر۔ دیکھیں گے بھئی۔ پہلے تم یہ بتاؤ۔ اس سارے چکر کے چلانے کی ضرورت کیا پیش آ گئی تھی۔ عرفان شیرازی کے جسم پر اس سوٹ کی کیا ضرورت تھی؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"نہیں بتاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"یہ بات تو تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔" فاروق بولا۔

"ہوں۔ تو پھر میں بتائے دیتا ہوں مسٹر۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سرفراز جانی کے ساتھ عرفان شیرازی کے بھی منہ سے نکلا۔

"پہلی بات تو یہ کہ جہاز ایک گھنٹا لیٹ نہیں تھا، لہٰذا سرفراز جانی نے جھوٹ بولا تھا۔ یہیں سے یہ حضرت مجرم یا مجرم کے ساتھی تو نظر آ گئے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ چکر کیا ہے۔ عرفان شیرازی کے لیے ایسا سوٹ بنوایا گیا تھا کہ وہ ہر سوال کا جواب دے سکے۔ آخر کیوں۔ کیا اسے ہر بات پہلے ہی معلوم نہیں تھی۔ کہ اس قسم کے سوٹ کی اسے ضرورت ہوتی۔ سوچ سوچ کر آخر میں ایک نتیجے پر پہنچا اور میں نے انشارجہ کے اس شہر سے معلومات حاصل کیں، جس شہر میں عرفان پڑھتا رہا تھا۔ مجھے اپنے ایک دوست کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ وہ بہت عرصے سے اس شہر میں رہ رہا ہے۔ اور ہے بھی جاسوس قسم کا آدمی۔ اسے بھی معلومات حاصل کرنے میں بہت دشواری ہوئی۔ بہرحال یہ کام اس نے اسی دن کر ڈالا تھا۔ جب عرفان شیرازی کے جسم پر وہ سوٹ نظر آیا تھا۔ میرے دوست نے بہت زیادہ حیرت انگیز خبریں مجھ تک پہنچائی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کچھ دن گزرے۔ انشارجہ کے اس شہر میں عرفان شیرازی کو کسی نے اغوا کر لیا تھا، لیکن پھر وہ پولیس کو مل گیا

اور اس نے بتایا کہ اغوا کرنے والے خود ہی اسے سڑک پر اتار کر چلے گئے۔ وہ نہیں جانتا، ان کا مقصد کیا تھا، پولیس کو بھی مزید تحقیقات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

"تو پھر۔ اس سے کیا نتیجہ نکلا؟"

"بہت خوف ناک۔"

"جی۔ کیا مطلب۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

خوفناک نتیجہ

انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا، پھر بولے:

"ہاں! بہت خوفناک نتیجہ نکلا۔"

"آخر کیا۔ جلدی بتائیں نا۔"

"پہلے تم لوگ بے چین تھے مس سائرہ ڈابر کی گم شدگی کے لیے۔ اور چاہتے تھے کہ میں پہلے ان دونوں سے سائرہ کے بارے میں پوچھوں، لیکن اب بے چین ہوں یہ جاننے کے لیے کہ وہ خوفناک نتیجہ کیا تھا۔ اب بتاؤ۔ پہلے کیا بات بتاؤں۔"

"اوہو ابّا جان! آپ تو بہت پُر اسرار نظر آ رہے ہیں۔" فاروق چونکا۔

"یہ میری پُرانی عادت ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" محمود مسکرایا۔

"کس میں؟" پروفیسر داؤد بے خیالی کے عالم میں بولے۔

"جی اسی میں- یعنی یہ کہ میری پُرانی عادت ہے پُراسرار نظر آنے کی۔" وہ بولے۔

"ہاں! یہ تو خیر بالکل ٹھیک ہے- اور مجھے تو تم اس وقت بھی حد درجے پُراسرار نظر آتے ہو، جب کوئی کیس حل نہیں کر رہے ہوتے۔"

"آخر یہ ہو کیا رہا ہے- آپ لوگ بیٹھے مزے سے باتیں کر رہے ہیں اور میری بیٹی گم ہے- ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔"

"بس آپ دیکھتے جائیے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور سرفراز جانی کی طرف مڑے:

"ہاں تو جناب- کیوں نہ ہم ایک عدد سودا کر لیں۔"

"کیسا سودا؟"

"آپ ہمیں مس سائرہ ڈابر کا پتا بتا دیں کہ ہم انھیں کہاں سے لا سکتے ہیں اور ہم ..."

"اور ہم کیا؟"

"اور ہم آپ کو اس کے بدلے میں پُرسکون انداز میں جیل پہنچا دیں گے- آپ کے ساتھ پولیس والی کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔"

"جی نہیں- اب تو آپ کو ہماری شرائط ماننا ہوں گی۔"

"اچھا- آپ کی شرائط کیا ہیں بھلا؟"

"ہم دونوں کو یہاں سے نکل جانے دیا جائے- سائرہ خود گھر پہنچ جائے گی۔"

"اس حد تک تو میں آپ پر اعتبار نہیں کر سکتا بڑے بھائی۔" انسپکٹر جمشید نے شوخ آواز میں کہا۔

"تب پھر جو جی میں آئے کر لیں- ہم سائرہ کا پتا نہیں بتائیں گے اور یہ بھی سُن لیں کہ اگر ہم آدھ گھنٹے تک ایک جگہ نہ پہنچے تو سائرہ کو ختم کر دیا جائے گا۔"

"نن- نہیں۔" خان ڈابر چلا اُٹھے- آنکھیں خوف سے پھیل گئیں:

"تم وعدہ کرتے ہو- وہاں پہنچ کر مس سائرہ ڈابر کو چھوڑ دو گے۔"

"ہاں بالکل۔"

"ہاں بالکل وعدہ کرتے ہیں۔" اس مرتبہ عرفان شیرازی نے بھی کہا۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے عرفان- تم تو میرے دوست کے بیٹے ہو- پھر تم نے اس بے ایمان کے ساتھ مل کر یہ سازش کیوں کی- کیوں کی؟" خان ڈابر رونے لگے۔

"میں تمھاری بات مان لیتا ہوں- تم جا سکتے ہو۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ سائرہ کو نہیں چھوڑیں گے۔" خان ڈابر نے چلّا کر کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تت۔ تو۔ تو کیا ہم واقعی جا سکتے ہیں؟"

"ہاں بالکل جا سکتے ہو۔ جاتے ہی مس سائرہ کو چھوڑ دینا، سمجھے۔ نہیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

"ابا جان! آپ بھول رہے ہیں۔" ایسے میں محمود نے جلدی سے کہا۔

"کیا بھول رہا ہوں۔ تم یاد کرا دو۔"

"یہ کہ۔ ان لوگوں نے ایک شخص کو قتل بھی کروایا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ کچلی ہوئی جو لاش ہمیں ملی تھی۔"

"مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ تم فکر نہ کرو۔"

"ہم جا رہے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد سائرہ یہاں ہوگی، ہم اپنا وعدہ ضرور پُورا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے بھائی، ٹھیک ہے۔"

انھوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"یہ آپ نے کیا کیا۔" خان ڈابر نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"اب میری بیٹی۔ میں آپ سے لوں گا اپنی بیٹی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں ان دونوں کو واپس بُلا لیتا ہوں۔"

"جی کیا مطلب؟"

"آ جاؤ بھئی واپس۔" انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

"بھلا وہ اس قدر آہستہ آواز سُن لیں گے۔ وہ تو اس وقت دروازے تک پہنچ چکے ہوں گے۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"ہاں واقعی۔ ان کے کان فرزانہ جتنے تیز تو نہیں ہو سکتے نا۔"

اسی وقت قدموں کی آواز پھر اُبھری۔ اور وہ حیران رہ گئے، کیونکہ سرفراز جانی اور عرفان شیرازی واپس چلے آ رہے تھے۔ اس طرح کہ ان کی گردنیں لٹکی ہوئی تھیں۔

"دیکھا! میری آواز انھوں نے سُن لی نا۔"

"کمال ہے۔ آپ آخر یہ کر کیا رہے ہیں۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس تیل دیکھو۔ تیل کی دھار دیکھو۔"

"ایک تو یہ تیل صاحب ٹپک پڑتے ہیں ہر جگہ۔" فاروق نے کہا۔

"کیوں بھئی - خیر تو ہے - واپس کیوں آ گئے؟" انسپکٹر جمشید بولے -

ان کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا -

"گونگے ہو گئے بے چارے - بہت زیادہ چالاک مجرم خیال کرتے رہے ہیں یہ دونوں اپنے آپ کو - انھوں نے پہلے ہی ہر ثبوت کو مٹا دینے کا پروگرام بنایا تھا - تاکہ کوئی ان کے جُرم کے بارے میں اندازہ تک نہ لگا سکے - لیکن ان سے سب سے بڑی غلطی بس یہی ہوئی کہ اس غریب کو کچل ڈالا - صرف اس خیال سے کہ کبھی نہ کبھی یہ راز ظاہر کر سکتا ہے - اس کے علاوہ انھوں نے ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا - یہاں تک کہ انشارجہ میں عرفان شیرازی کو اغوا بھی خود کیا تھا۔"

"عرفان شیرازی کو اغوا انھوں نے خود کیا تھا - یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں - عرفان شیرازی تو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔" خان ڈابر نے بوکھلا کر کہا -

"یہی تو آپ سمجھے نہیں خان صاحب - یہ عرفان شیرازی نہیں ہے۔"

"نہیں !!!" ان کے منہ سے نکلا -

"اُف مالک - تو اس نے عرفان شیرازی کی جگہ لی ہے

اور اسی لیے اسے ایک ایسے کوٹ کی ضرورت تھی - جس کی مدد سے یہ ہر سوال کا جواب دے سکے اور کہیں بھی اسے بوکھلانے کی ضرورت نہ پیش آئے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا -

"ہاں ! یہی بات ہے - لیکن یہ دونوں ایک بات بالکل بھول گئے تھے۔"

"اور وہ کیا بات ہے؟" خان ڈابر نے حیران ہو کر پوچھا -

"یہ کہ - جرم کبھی چھپا نہیں رہتا - ایک دن ظاہر ہو کر رہتا ہے۔"

"تو پھر آخر - یہ عرفان شیرازی - میرا مطلب ہے - نقلی عرفان شیرازی ہے کون؟"

"ہاں ! اب یہ بات بتانا رہ گئی - یعنی - یہ اپنے سرفراز جانی کا بیٹا ہے۔"

"کیا !!!" وہ ایک ساتھ چلّائے -

"ہاں ! میں نے تمام تحقیقات کرا لی ہیں - اس نے بھی اپنے بیٹے کو انشارجہ بھیجا ہوا تھا - کیوں خان صاحب - یہی بات ہے نا؟"

"ہاں" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے -

"بس انھوں نے بہت عرصہ پہلے یہ منصوبہ بنا لیا تھا کہ اصل عرفان شیرازی کی جگہ اسے سونپ دیں گے - اور اس

طرح یہ نہ صرف عرفان شیرازی کی دولت کا مالک بن جائے گا۔ بلکہ خان ڈابر کی بیٹی سے شادی کے بعد ان کے حصّے کی ساری دولت بھی اسی کے قبضے میں چلی جاتی، کیونکہ خان ڈابر کی ایک ہی بیٹی ہے۔"

"اور میری بیٹی کہاں ہے؟"

"یہیں موجود ہے۔ کوٹھی کے دروازے پر گاڑی میں ۔ باہر میرے آدمی موجود ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھی ہے۔ اسی کو دیکھ کر تو یہ دونوں منہ لٹکا کر واپس آ گئے تھے، یوں بھی سادہ لباس والے بھلا انھیں کیوں جانے دیتے۔"

"اُف مالک ۔ میرے فرشتوں کو بھی پتا نہ چلتا اور یہ بیٹھے بٹھائے ہر چیز کے مالک بن جاتے۔"

"ہاں! منصوبہ اس لحاظ سے بہت ظالم تھا، لیکن ان کی بدقسمتی کہ ہم آڑے آ گئے۔"

"ہم لوگوں میں بس یہی تو ایک بُری بات ہے ۔ جب دیکھو ۔ جہاں دیکھو، آڑے آ جاتے ہیں۔ پتا نہیں، کیا رکھا ہے آڑے آنے میں ۔ آخر ہم لوگ سیدھے کیوں نہیں آتے۔" فارُوق نے جلدی جلدی کہا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر اس کی کمر پر ایک ہاتھ رسید کر دیا۔

"لیجیے، اب کمر اور ران میں بھی فرق نہیں رہ گیا ان کے نزدیک۔" فارُوق تلملا کر اُس پر اُلٹ پڑا ۔ وہ بچنے کے لیے جھکا تو فرزانہ سے ٹکرا گیا۔

"حد ہو گئی۔" فرزانہ نے بھنّا کر کہا۔

اور پھر تو انسپکٹر جمشید کو ان میں بیچ بچاؤ کے لیے حرکت میں آنا پڑا۔